انتظار حسین
شہرزاد کے نام
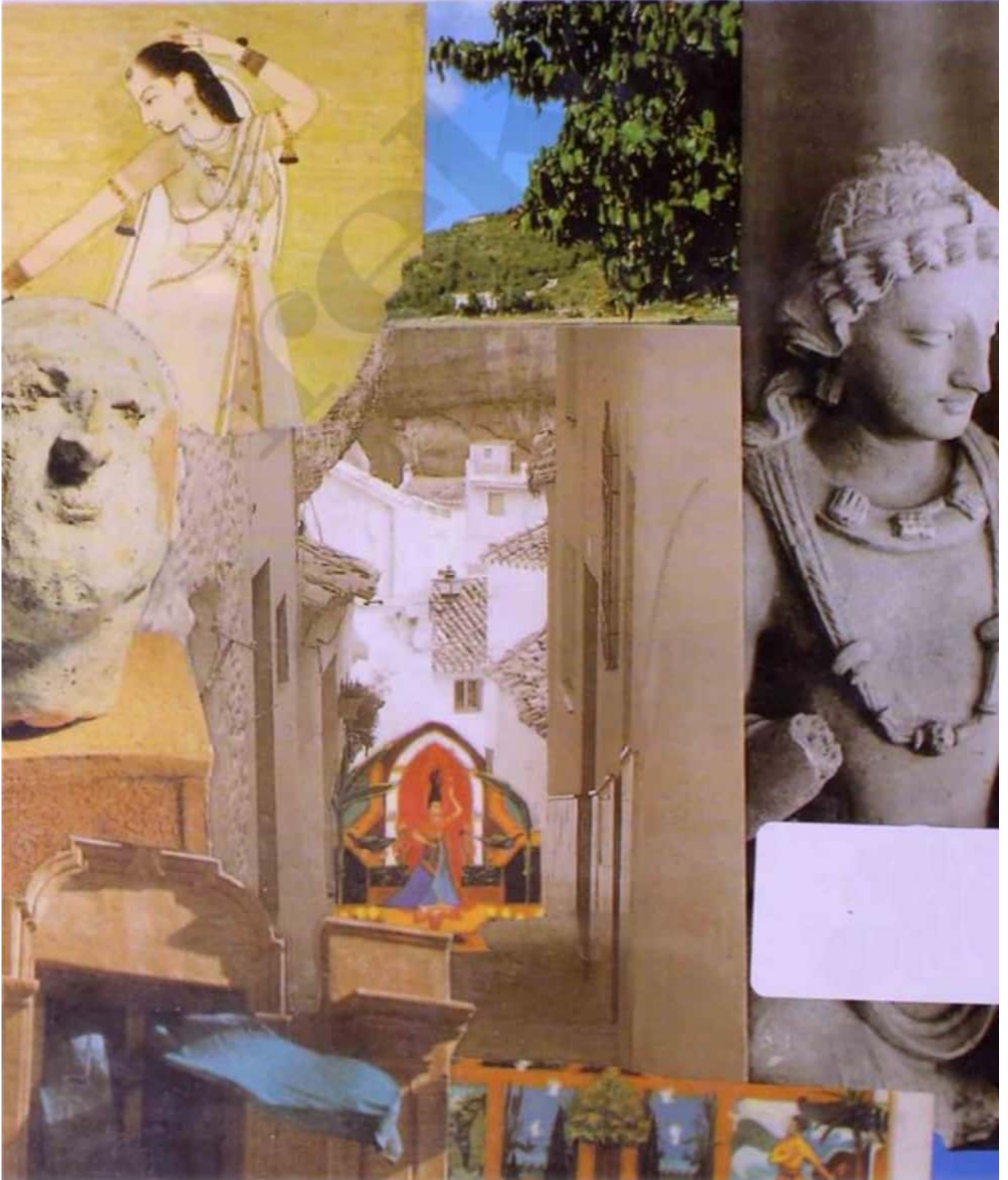
شہرزاد کے نام

انتظار حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Intizar Hussain
Shehrzad Ke Naam / Intizar Hussain. -Lahore : Sang - e - Meel Publications, 2002.
192p.
1. Afsaney. I. Title.

2002.
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1332-0

Sang-e-Meel Publications
Phones 7220100-7228143 Fax 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

مظفر علی سید کے نام

ترتیب

دائرہ

مجھے جیسے کوئی اکسا رہا ہے کہ یہ وقت ہے راکھ کو کریدنے کا۔ اس اکساوے میں آ کر پچاس برس پہلے کی راکھ کریدنے بیٹھ جاتا ہوں۔ جستجو کے لیے اب وہاں کیا رکھا ہے۔ مگر راکھ کریدنے کی لت جو ہوئی۔ کچھ گرد آلود گلیاں' کچھ اجلے میلے چہرے' کچھ آوازیں' کوئی کاہی لگی منڈیر' کوئی شکستہ برجی' کچھ درخت کچھ چڑیاں بس یہی کچھ تصور میں ابھرتا ہے۔ دھیرے دھیرے ایک نقشہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ایک دکان کا تھڑا' تھڑے پر بیٹھے ہنستے بولتے کچھ لوگ' دکاندار جو کڑھاو میں ابلتے دودھ کو کرچھے سے چلائے جا رہا ہے۔ ارے یہ تو میری پہلی کہانی کا منظر ہے۔ اب یاد آئی ہے اس احساس کے ساتھ کہ یہ تو بہت تشنہ ہے۔ بلکہ یہ تو وہ کہانی ہے ہی نہیں جو میں لکھنی چاہتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں سے مرکزی کردار غائب ہے۔ قیوما تو اس کہانی کا مرکزی کردار نہیں تھا۔ وہ تو دوسرا شخص تھا۔ جانے اس وقت کہانی لکھتے ہوئے میں اسے کیسے بھول گیا۔ اب یاد آیا ہے' پچاس برس بعد۔ بلکہ اب تو اس تھڑے پہ بیٹھی ہوئی وہ پوری ٹولی' وہ سارے کردار زیادہ تفصیل سے یاد آ رہے ہیں۔ ان دنوں تو میرا حافظہ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ حافظہ نے برسوں کے عمل میں اب براقی سے کام کرنا شروع کیا ہے۔

اب تصور میں منظر روشن ہونے شروع ہوئے ہیں۔

تو کیا مجھے اپنی پچاس برس ادھر کی لکھی ہوئی کہانی دوبارہ لکھنی چاہیے۔ مگر مجھے کرن کی کہی ہوئی ایک بات یاد آرہی ہے۔اس ساپن کو جواشو سین ناگ کی ماں تھی ارجن نے کھانڈو بن میں مارا تھا۔جب کرن ارجن پر تیر چلانے لگا تواشو سین نے سوچا کہ یہ موقع ہے بدلہ لینے کا۔ وہ پاتال سے سرسراتا آیااور کرن کے تیر کے گرد لپٹ گیا۔ مگر کرشن جی کی ایک چال سے ارجن کا رتھ عین اسی وقت زمین میں دھنس گیااور کرن کا تیر خطا ہو گیا۔ اشوسین ناگ نے کرن سے درخواست کی کہ مجھے دوبارہ تیر میں جوڑ اور پھر اسے چلا۔ کرن نے کہا کہ میں چلے ہوئے تیر کو دوبارہ چلے میں جوڑنے کا قائل نہیں۔ وہ تیر خطا ہو گیا تو یہ اس کی قسمت۔ میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں جو کہانی خطا ہو گئی ہے اسے دوبارہ لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ہاں کرنی چاہیے' کتنی ہچر مچر کے بعد میں طے کرتا ہوں۔ کرن کی بات کرن کے ساتھ گئی۔ مجھے اس کہانی کو دوبارہ لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

نہیں یہ کہانی تمہارے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔اب اسے کوئی دوسرا ہی لکھے گا۔

میں سنتا ہوں اور شش و پنج میں پڑ جاتا ہوں۔ آواز کہاں سے آئی کسی طرف سے بھی آئی ہو' اندر سے یا کہانی کے کرداروں کے بیچ سے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی دوسرا بھی لکھے۔ مگر یہ کہانی ایک دفعہ پھر لکھی جانی چاہیے۔ مگر کون دوسرا لکھے گا۔ ویسے تو کوئی بھی دوسرا ہو سکتا ہے۔ آخر وہاں اکیلا میں ہی تو نہیں تھا۔ کتنے بہت سے تھے۔ اگرچہ سب ہی نکل کھڑے ہوئے تھے سوائے اس شخص کے۔ بہر حال وہ دوسرا کون ہو گا۔ وہ دوسرا میں ہی ہوں۔اب میں اس کہانی کو لکھوں گا۔ ہاں میں...... ویسے تو میں بھی انہیں میں سے ہوں جو نکل کھڑے ہوئے تھے مگر باقیوں نے نئے دیار میں پہنچ

کر اپنے ٹھکانے بنا لیے۔ بس مجھے قرار میسر نہیں آیا۔ کبھی کبھی تو وہم میں پڑ جاتا ہوں کہ وہاں سے نکلا بھی ہوں یا نہیں۔ گویا صورت یہ ہے کہ وہ شخص ادھر رہ گیا۔ باقی ادھر آ گئے۔ میں جیسے نہ وہاں نہ یہاں۔ ایک بیقرار روح۔ خیر مجھے اپنی کہانی تو نہیں سنانی۔ کہانی اس شخص کی سنانی ہے جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔

کہانی سنانے سے پہلے مجھے اس بستی کا نقشہ آپ کو سمجھانا ہوگا۔ مگر اس سلسلے میں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بستیاں خالی جغرافیہ نہیں ہوتیں اور محض زمین پر آباد نہیں ہوتیں۔ آدھی زمین پر ہوتی ہیں' آدھی دل و دماغ میں بسی ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس کا جغرافیائی نام بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جیسی وہ زمین پر آباد ہے وہ بھی ہے اور اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے میں نے اس کے اتنے روپ دیکھے ہیں کہ اسے روپ نگر کہنے لگا ہوں۔ کیا نگر تھا' میرا مطلب ہے کہ ہے۔ بظاہر عام سی بستی۔ ویسی ہی بے رنگی جو چھوٹی بستیوں کا مقدر ہے۔ پنساریوں والے بازار میں کتنی بھیڑ ہوتی تھی۔ اور فضا میں ہینگ کی بو بسی رہتی تھی۔ ہینگ' ہلدی' مرچیں' نمک' ان کی بوریاں بھری دکانوں میں رکھی رہتی تھیں۔ ویسے ملنے کو یہاں کیا نہیں ملتا تھا۔ جب ہمارے گھر میں کسی آئے گئے کے لیے پلاؤ اور قورمہ پکتا تھا تو الائچی' جاوتری' جائفل' تیج پات' زعفران سب چیزیں میں یہیں سے چھوٹی بڑی پڑیوں میں بندھوا کر لے جاتا تھا۔ اس سے زیادہ بھیڑ منڈی میں ہوتی تھی جہاں کپاس کے ڈھیر لگے ہوتے تھے اور گیہوں سے بھری گاڑیاں اور گڑ کی بھیلیاں۔ گاہکوں کی بھیڑ الٰہی توبہ۔ گاہکوں سے زیادہ گڑ سلیں۔ انہیں میں رلی ملی گوریا چڑیاں اور جنگلی کبوتر۔ اِکّادُکّا فاختہ۔ یہاں سے زیادہ بھیڑ تو بس پینٹھ ہی میں دکھائی دیتی تھی۔ پینٹھ تالاب کے برابر والے میدان میں لگتی تھی۔ پینٹھ میں گنوروں دل بہت ہوتی تھی۔ مٹی بھی اتنی ہی اڑتی تھی۔ شام ہوتے ہوتے مولی شلجم' گوبھی' بند گوبھی' کاشی پھل' پالک' میتھی' بتھوا' گندل' قلفہ ساگ' آلو' رتالو' کمرخ'

لوکاٹ، سینڈیں، پھوٹ سب ہی پر گرد کی تہہ جم جاتی تھی۔

ویسے تالاب میں پانی تو بس برسات کے دنوں ہی میں امنڈ تا تھا۔ کتنا بڑا اور کتنا گہرا تالاب تھا۔ اور چاروں طرف سیڑھیاں ہی سیڑھیاں، لگتا تھا کہ سمندر امنڈ آیا ہے۔ مگر برسات کے بعد پانی میٹالے سے سبز ہوتا چلا جاتا۔ خشک ہوتے ہوتے سب سے نچلی سیڑھی تک رہ جاتا۔ پھر دھیرے دھیرے وہ بھی خشک ہو جاتا۔ بس پھر وہاں خاک ہی اڑتی تھی۔ یہ تالاب خشکی کے دنوں میں تو بس اپنے دو بجاروں ہی سے پہچانا جاتا تھا۔ ایک زردی مائل سفید، دوسرا کالا۔ دونوں کس وقار سے چپ چاپ کھڑے رہتے۔ ایک تالاب کے دائیں سمت، دوسرا اس کے بالمقابل بائیں سمت، سفید بجار زیادہ چست تھا۔ کسی بھی وقت دڑوکنا شروع کر دیتا۔ پھر اسی کیفیت میں دڑوکتا پھنکارتا بازار کی طرف چل پڑتا۔ کیا رعب داب تھا کہ بھیڑ کائی کی طرح پھٹ جاتی اور وہ اپنے حال میں مست گذرا چلا جاتا۔ کبھی کبھی کالے بجار کو بھی جھرجھری آجاتی۔ وہ اپنی شان سے دڑوکنا پھنکارتا، تالاب سے چلتا اور اپنی کھال میں مست پنساری بازار سے منڈی کی طرف، منڈی سے چھوٹی بزریا کی طرف بڑھتا چلا جاتا۔ چھوٹی بزریا پہ یاد آیا کہ یہاں ایک دفعہ دونوں بجاروں کا آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ بس قیامت ہی تو آگئی۔ دیر تک سینگ سے سینگ پھنسے رہے۔ سفید کالے کو کتنی دور تک ڈھکیلتا لے گیا۔ مگر پھر کالے نے جو ایک مرتبہ اسے ڈھکیلا ہے تو بس یہ سمجھو کہ مٹھن لال حلوائی کی ساری تھالیں اوندھ گئیں۔

مٹھن لال کی کیا بات تھی۔ گجیا تو ایسی بناتا تھا کہ متھرا اور بدائیوں کے پیڑوں والے آکر اس کے ہاتھ چومتے تھے۔ دیوالی کی رات اس کی دکان کی کیا شان ہوتی تھی۔ نیچے سے لے کر اوپر چھت تک مٹھائیوں کی تھالیں قطار اندر قطار چنی نظر آتیں تھیں۔ اور گجیوں سے تنگنی تک کونسی مٹھائی تھی کہ نہیں ہوتی تھی۔

قیوما کی دکان پہ کیا ملتا تھا۔ خالی پیڑے۔ اور وہ بھی ایسے تو نہیں ہوتے تھے کہ مٹھن لال کی گجیوں اور پیڑوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ویسے بھی یہ کوئی بازار تھوڑا ہی تھا۔ حافظ جی کی چوپال کے سامنے یہ اکلوتی دکان تھی۔ سو یہاں کوئی بھیڑ بھڑ کا تھا ہی نہیں۔ ہاں چھٹے چھ ماہے اور بعض موسموں میں ہفتے عشرے میں ایک شور اٹھتا رام نام ستیہ ہے' رام نام ستیہ ہے۔ اور ایک ارتھی تیزی سے گذری چلی جاتی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہندنیوں کی سوگوار ٹولی ایندھن سنبھالے بین کرتی گذرتی دکھائی دیتی۔ ویسے تو یہ مسلمانوں کا محلّہ تھا۔ لیکن کیا کیا جاتا' مجبوری تھی۔ چامنڈا کو راستہ اسی طرف سے جاتا تھا۔ باقی ہندوؤں کا کوئی جلوس کوئی برات اس طرف کا رخ نہیں کرتی تھی۔ وہ ساری براتیں جن کے آگے آگے پتنگیا کاغذ اور پنی سے بنے سجے دو بڑے بڑے گھوڑے ہوتے تھے اس گلی کے نکڑ تک آکر الٹے ہاتھ کو لال مندر والی گلی میں مڑ جاتی تھیں۔ رام چندر جی کی بُرات بھی اسی گلی میں مڑ جاتی تھی۔ سو قیوما کی دکان پر بیٹھنے والوں کو اس لال پیلے چار خانے سے سجے مستک والے ہاتھی کو دیکھنے کے لیے جس کے ہودے میں راجہ رام چندر جی اور سیتا جی دولہا دلہن بنے بیٹھے ہوتے تھے دکان کے تھڑے سے اٹھ کر اس گلی کے نکڑ پر آنا پڑتا تھا۔ ہولی کھیلنے والی ٹولیوں کا بھی راستہ اسی طرح تھا۔ سب سے زیادہ دھوم سے رام چندر جی کی برات نکلتی تھی۔ اس سے بڑا جلوس تو یہاں سے ایک ہی نکلا تھا۔ وہ اس وقت جب ماسٹر پیارے لال نے گرفتاری دی تھی۔ اتنا مجمع تھا اور اتنا غصے میں تھا کہ تھانے پر وہ ہلہ بول دیتے تو سپاہیوں کی تکا بوٹی کر دیتے۔ ویسے بندوقیں سپاہیوں نے بھی تان لی تھیں۔ مگر ماسٹر پیارے لال تھانے میں داخل ہوتے ہوئے رکے۔ اونچی آواز سے کہا کہ 'سجنو' مہاتما گاندھی کی سکشا کو مت بھولو۔ ہم اندولن کی بات نہیں کرتے۔ اہنسا کا پرچار کرتے ہیں۔ یہی گاندھی جی کی سکشا ہے۔ یہی ہمارا نیم ہے۔ اور اسی میں ہماری ساری جنتا کی سپھلتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی...... پورا مجمع

چلایا ہے۔ پھر انقلاب زندہ باد اور مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے لگنے لگے۔ ماسٹر پیارے لال نے ہاتھ جوڑ کے سب کو پرنام کیا اور تھانے کے اندر چلے گئے۔ فوراً ہی لوہے کی سلاخوں والا وہ اونچا چوڑا پھاٹک بند ہو گیا۔ اس بستی کی تاریخ میں بجاروں کی لڑائی کے بعد یہ دوسرا بڑا واقعہ تھا۔

قیوما کی دکان کے سامنے سے تو بس ایک ہی جلوس گذرتا تھا۔ اور وہ بھی کونسا بڑا جلوس ہوتا تھا۔ شاہ مدار کی چھڑیوں کا جلوس۔ چھڑیاں کہاں ہوتی تھیں۔ بس ایک بہت اونچی چھڑ جتنا اونچا بڑا علم ہوتا ہے۔ ساتھ میں ڈھول اور تاشے بجتے ہوئے۔ ایک درویش صورت شخص۔ لمبی زلفیں، بر میں سبز لبادہ، گلے میں کلاوہ، شاہ مدار کا مجاور، فاروق چچا کے پھاٹک کے پاس چھڑ گاڑ دیتا۔ ڈھول اور تاشے خوب زور سے بجتے۔ پھر کوئی سخی آ کر ملیدہ بانٹنا شروع کر دیتا۔

اے لو بڑے جلوس کو تو میں بھولا ہی جا رہا ہوں۔ ذوالجناح کا جلوس بھی تو اسی راستے سے گذرتا تھا۔ اصل میں کربلا کا راستہ بھی تو اسی طرف سے جاتا تھا۔ سیدھے چلے جاؤ تو چامنڈا پہ جا نکلو گے۔ بائیں مڑ جاؤ تو تھوڑی دور جا کر کربلا کی کاہی آلود برجیاں دکھائی دینے لگیں گی۔ مگر کربلا کا ذکر فی الحال جانے دو۔ اس طرف گیا تو پھر واپس نہیں آؤں گا۔ چامنڈا کی طرف چلنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس کے آس پاس تو میں بہت گھوما پھرا ہوں۔ تپتی دوپہریوں میں یاں سے لے کر پلیا تک بہت خاک اڑائی ہے۔ جب گرمی سے برا حال ہو جاتا اور دھوپ میں چلنا دوبھر ہو جاتا تو چامنڈا کی چھت پہ جا بیٹھتے جس پہ ایک پرانے گھنے پیپل نے سایہ کیا ہوا تھا۔ لے دے کے یہی تو یاں پہ گھنی چھاؤں والا درخت تھا۔ باقی دور تک نہ کوئی برگد، نہ کوئی امریا، نہ املی، اجاڑ سی جگہ تھی۔ چامنڈا نے اسے اور اجاڑ بنا دیا تھا۔ لگتا تھا کہ گذرے زمانوں میں کوئی بڑا مندر رہو گا۔ مگر زمانہ سارے مندر کو چاٹ گیا۔ بس کاہی لگی چند دیواریں اور

ایک چھت رہ گئی تھی۔ چھت تلے رکھی ہوئی ایک مورتی جس کے چرنوں میں ہم نے تو کبھی تازہ پھول دیکھے نہیں۔ اس کے پچھواڑے مرگھٹ بھی ویران سنسان دکھائی پڑتا تھا۔ جانے ارتھی کب آتی تھی اور کب چتا جلتی تھی۔ تو آدمی تو یاں کم از کم ان سناہٹی تپتی دوپہروں میں مشکل ہی سے دکھائی دیتا تھا۔ ہاں چامنڈا کی چھت پہ پیپل کی چھاؤں تلے بیٹھے بیٹھے دور دگڑے کے اس پار پیلی مٹی کے ٹیلوں کے بیچ کچھ مزدور پھاوڑوں سے مٹی کھودتے اور گدھوں پر لادتے دکھائی دیتے۔ وہاں سے ایسا لگتا کہ جیسے وہ کوئی دوسری ہی دنیا ہے۔ چامنڈا کے آس پاس تو آدمی کی صورت ہی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بس ہم ہوتے تھے اور پیپل کی شاخوں پر کودتے بندر۔ پھر بھی ہمیں ڈر نہیں لگتا تھا۔ ڈر تو رات کو اس وقت لگتا تھا جب چامنڈا کی طرف سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ رات کے سناٹے میں یہ آوازیں اس طرح آتیں کہ اپنے پلنگ پہ لیٹے لیٹے میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا۔ مجھے ایسا لگتا کہ جیسے دور دور کے جنگلوں سے نکل کر سارے گیدڑ چامنڈا کے پاس جمع ہو گئے ہیں اور ہمارے گھر کی طرف منہ کر کے چلّا رہے ہیں۔

دن میں تو بس ایک ہی دفعہ مجھے ڈر لگا تھا۔ مگر میں اکیلا تھوڑا ہی ڈرا تھا۔ پوری ٹولی تھی۔ سناہٹی دوپہر میں ہم چامنڈا سے نکل کر دگڑے دگڑے چلے جارہے تھے کہ شدوا اچانک حیرت بھری آواز میں بولا "عورت۔"

"عورت" ہم سب ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے "کہاں۔"

"وہ جارہی ہے۔"

ہم سے اچھے خاصے فاصلہ پر دگڑے سے ہٹ کر ایک عورت چلی جارہی تھی۔ مدھم سرخ رنگ کا گھگرا اسی رنگ کی چولی' ناک میں بلاق' کانوں میں بڑے بڑے بالے۔

"ابے اُلّو کے پٹھو' یہ عورت نہیں ہے۔"

"پھر کون ہے۔"

"اس کے پیر دیکھ لو۔ پتہ چل جائے گا۔"

پھر جو ہم نے دیکھا تو عورت غائب۔

"یار، وہ گئی کدھر۔"

عین اسی وقت آسمان پہ منڈلاتی ایک چیل کرلائی۔ عجیب آواز تھی کہ فضا میں ایک خراش سی پڑتی چلی گئی۔

"ابے بھاگو۔"

اور ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ چیل کی کرلاہٹ نے دور تک ہمارا پیچھا کیا۔

مگر میں سارا ذکر ماضی کے صیغہ میں کیوں کر رہا ہوں۔ وہ نقشہ تو جوں کا توں ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہی تو میں نے وہاں کا پھیرا لگایا تھا۔ بھلا میں نے پچھلا خواب کب دیکھا تھا۔ اس خواب میں وہاں کا نقشہ جوں کا توں تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ روشن تھا۔ یا مجھے لگا۔ تفصیل سے تو میں نے اس سارے نقشہ کو اب دیکھا ہے۔ پتہ چلا کہ چیزیں اپنا آپ اصل میں تو خواب ہی میں دکھاتی ہیں۔ در و دیوار، گلیاں، کوچے، پیڑ پودے، زمین، آسمان، ایک مرتبہ آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد جب خواب میں آکر آپ کو پکارتے ہیں تو پھر وہ اپنا پورا درشن کراتے ہیں۔ ایک خواب، پھر دوسرا خواب، پھر تیسرا اور چوتھا۔ کتنے خوابوں میں جاکر بستی نکھر کر سامنے آئی ہے اور پورے درشن ہوئے ہیں۔

پورے درشن۔ میں غلط کہہ گیا۔ وہ ابھی کہاں ہوئے ہیں۔ کیونکہ کربلا تک تو میں ابھی پہنچا ہی نہیں ہوں۔ میں کس شوق سے اس طرف جاتا ہوں۔ پھر پتہ نہیں رستے میں کیا ہو جاتا ہے اور فوراً ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ کربلا کے بغیر تو یہ سارا نقشہ نامکمل ہے۔ وہ ہی تو اس بستی کے سارے داخل خارج کا نقطہ عروج تھا۔ وہیں جاکر یہ

پورا نقشہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا تھا۔ ہمارے بھی سفر شوق کی آخری منزل تو وہی تھی۔ لمبی سناہٹی دوپہر جو کسی طور ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ جب گلی گلی کی خاک چھان ڈالتے اور چامنڈا سے چل کر پلیا تک جاکر واپس ہونے لگتے تو ہم میں سے کوئی اچانک بول اٹھتا "یار کربلا چلیں" اور جیسے وہ ہم سب کے دلوں کی آواز ہوتی۔ ہمارے قدم فوراً ہی اس طرف اٹھ جاتے۔ چامنڈا سے چلے پرانے قلعہ کی طرف۔ پرانے قلعہ کے ٹیلہ کے برابر سے نکلے تو لیجیے شیخ مدو کے کھیت آ گئے۔ رہٹ چل رہی ہے۔ اس سے آگے لال املی۔ لال املی سے آگے بوا پہلوان کا اکھاڑہ۔ بوا پہلوان کے اکھاڑے سے آگے بیریاں۔ بیریوں سے آگے گورے کی قبر۔ گورے کی قبر سے آگے سنبھلی والوں کا باغ۔ بس باغ سے نکلے تو پھر سامنے کربلا ہے۔ ایک لمبی چوڑی چار دیواری۔ اس کے بیچ ایک اجڑا اجڑا سا میدان۔ ایک گوشے میں دو گہرے گڑھے۔ ایک گڑھے میں شیعوں کے تعزیے دفن ہوتے تھے۔ دوسرے گڑھے میں سنیوں کے تعزیے۔ دروازہ اس کا کتنا اونچا اور باوقار تھا۔ سلاخوں والا پھاٹک، دائیں بائیں دو اونچے موٹے ستون۔ ستونوں پر قائم دو برجیاں جو برسات اور آندھیوں کی مار کھا کھا کے کالی پڑ گئی تھیں جیسے دھات کی ہوں اور ان پر زنگ جم گئی ہو۔ پھاٹک تو محرم کے دنوں کے سوا کبھی کبھار ہی کھلتا تھا۔ باقی تو اس میں موٹا تالا پڑا رہتا تھا۔ بس سلاخوں کے بیچ سے بھری دوپہر میں جب ہم اس دھوپ سے تپتے اجڑے میدان کو دیکھتے تو وہ سچ مچ کربلا کا میدان دکھائی پڑتا تھا۔ لو بھی تو واں پہ ایسی چلتی تھی جیسے کربلا کی لو ہو۔ وہ تو یہ کہیے کہ پھاٹک کے سامنے والے چبوترے کے اس طرف بھولو کی کٹیا تھی جس کے کچے احاطہ میں کیتھوں کے پیڑ تلے پانی سے بھرا مٹکا رکھا رہتا تھا۔ چھپڑ میں بندھے ناریل کے تونبے سے پانی نکال نکال کر اوک سے پیا اور پھر آسودہ ہو کر چبوترے پر آن بیٹھے۔ چبوترے کے بیچوں بیچ جو پیپل تھا وہ بہت ہی گھنا تھا۔ چبوترے پہ مستقل چھاؤں رہتی تھی۔ باقی املی کے پیڑ تو

سارے کے سارے کربلا کی بائیں ہاتھ والی دیوار کے برابر میں تھے۔ کتنے اونچے پیڑ تھے اور کتنے گھنے۔ اتنی کتاریں جھڑتی تھیں کہ سمیٹے نہیں سمٹتی تھیں۔ کربلا کی دیوار سے لے کر ہاتھی کی قبر تک املیاں ہی املیاں۔ خونیں املی تو بس ایک تھی جو ہاتھی کی قبر کے برابر کھڑی تھی۔ اس کی کتار دانتوں سے چباتے تو سچ مچ لگتا کہ اس میں سے خون نکل رہا ہے۔ میں نہ کہتا تھا کہ کربلا کی طرف نکل گیا تو پھر واپس نہیں آسکوں گا۔ جگہ ہی ایسی ہے۔ لیکن اس کے متعلق اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے کہ اس جگہ کو تو میں نے پچھلے پچاس برس سے دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہاں تک پہنچ ہی نہیں پایا۔ بہت آگے گیا تو بوا کے اکھاڑے تک پہنچ جاتا ہوں۔ خوش ہوتا ہوں کہ لو بس آگئی کربلا۔ سنبھلی والوں کے باغ سے نکلوں گا اور کربلا جا پہنچوں گا۔ مگر فوراً ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ ہاں ایک دفعہ تو میں سنبھلی والوں کے باغ تک بھی پہنچ گیا تھا۔ شیخ مدد علی سنبھلی کی قبر کیسی مہک رہی تھی۔ سرہانے کھڑے ہار سنگھار سے اتنے پھول گرے تھے کہ قبر پہ ہار سنگھار کا بستر بچھ گیا تھا۔ شیخ مرحوم کیا پر سوز آواز میں سوز خوانی کرتے تھے کہ پتھر دل والے بھی تر بتر رومال کے ساتھ مجلس سے رخصت ہوتے تھے۔ ان کے امام باڑے میں سب سے زیادہ رقت آٹھ کی شب کو ہوتی تھی۔ جب آدھی رات گذر جاتی تو بڑے علم کی مجلس شروع ہوتی اور شیخ صاحب درد بھری آواز میں شروع ہوتے

جب قصد کیا نہر کا سقائے حرم نے

پہلے ہی مصرعہ پر آہ و بکا شروع ہو جاتی اور جب علم نکلتا تو کیسی پٹس پڑتی تھی۔ باہر تاشوں کی آواز' اندر ماتم کا شور' امام باڑے کے در و دیوار ہل جاتے تھے۔ ماتمی غش کھا کھا کر گرتے اور مستعد رضا کار ہر غش کھانے والے کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر لے جاتے اور تخت پر لٹا کر گلاب پاش سے اتنا گلاب چھڑکتے کہ چہرہ گردن سینہ سب مہکتے عرق سے تر بتر ہو جاتے۔ مگر ادھر صبح کی اذان کان میں پڑی اور ادھر تاشے والوں نے

آخری قینچی لگا کر تاشے گلے سے اتارے۔ ماتمیوں نے ماتم بند کیا، بڑا علم اپنے چمکتے لچکتے پنجہ اور سرخ چھینٹوں سے آلودہ ٹپکے کے ساتھ علموں کی کوٹھڑی میں واپس جا کر نظروں سے اوجھل ہوا۔ گریہ کا شور دھیما پڑتے پڑتے سسکیوں میں بدل جاتا اور پھر فوراً ہی شیر مال بٹنے شروع ہو جاتے۔ بڑے علم کی مجلس میں شیر مال کا تبرک بٹتا تھا۔ جھٹپٹے میں شیر مال لے کر میں گھر کی طرف چلتا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا اجالا ہو جاتا تھا۔

تاریخ میں بھی تو کبھی کبھی جھٹپٹے کا وقت آتا ہے۔ اس برس کا محرم ایسے ہی وقت میں آیا تھا۔ شیخ مدد علی سنبھلی کی زندگی کا تو وہ آخری محرم تھا۔ بیٹے نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں رہنے کا دھرم نہیں رہا۔ بس محرم کے بعد نکل لیں گے۔ چاند رات کی مجلس میں شیخ صاحب نے اپنی روایت کے مطابق وہی سوز شروع کیا۔

جب کوچ کی شب قبر نبی پہ گئے شبیر

مگر پہلے ہی مصرعہ پہ ان پہ ایسی رقت طاری ہوئی کہ دوسرے مصرعہ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ باقی مرثیہ بازوؤں نے پورا کیا۔ پھر آٹھ کی شب بڑے علم کی مجلس میں بھی وہ روایتی سوز جو شیخ صاحب پڑھا کرتے تھے ان کے بازوؤں ہی نے پڑھا۔ شیخ صاحب پلنگ پہ ایسے پڑے کہ پھر اٹھے نہیں۔ ہفتوں میں چٹ پٹ ہو گئے۔ سنبھلی گھرانا اپنے بزرگ کو اس مٹی میں دفن کرنے کے بعد اس نگر سے نکلا۔

لو میں کدھر سے کدھر نکل گیا۔ کہہ میں یہ رہا تھا کہ اس دفعہ میں سنبھل والوں کے باغ تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے تو میں وہیں کہیں قیوما کی دکان کے آس پاس کسی گلی میں بھٹکتا رہ جاتا تھا اور آنکھ کھل جاتی تھی۔ ان گلیوں نے مجھے بہت خراب کیا۔ ان میں بھٹکتے ہوئے بہت وقت نکل جاتا تھا۔ ایک دفعہ بہت بری ہوئی۔ میں رستہ بھول گیا۔ ایک گلی سے نکلوں تو دوسری گلی میں جا نکلوں۔ دوسری گلی سے باہر آؤں تو تیسری گلی۔ یا اللہ میں کس جھمیلے میں پھنس گیا۔ یہ تو گلیوں کا جال ہے۔ ہمارے نگر میں

اتنی گلیاں تو نہیں تھیں۔ تو میں کسی اور نگر میں آنکلا ہوں۔ مگر نہیں' لگتا تو اپنا ہی نگر ہے۔ مگر یہ گلیاں۔ یہ اتنی بہت سی گلیاں کہاں سے آ گئیں۔ ارے کہیں میں قاضی خیل میں تو نہیں نکل آیا۔ اچھا اگر یہ قاضی خیل ہے تو شاویلات کدھر ہے۔ میں نے بہت ڈھونڈا' شاویلات کہیں دکھائی ہی نہیں دی۔ نہیں تو پھر یہ قاضی خیل نہیں ہے۔ تو پھر ہندو واڑہ ہو گا۔ ہندو واڑے میں بہت پتلی پتلی گلیاں تھیں مگر وہاں تو ہر گھر کے دروازے کے برابر چونے والی دیوار پہ گیرو سے ہنومان جی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ پھر ایک چوک آتا تھا جہاں بیچ میں لال پتھر والا کنواں تھا۔ ادھر سے آگے بڑھو تو گلی ختم۔ وہاں سے پینٹھ والی سڑک پہ آجاتے تھے۔ سامنے تالاب دکھائی دیتا تھا۔ یہ نہیں تو پھر یہ ہندو واڑہ نہیں ہے۔ میں کتنی دیر بھٹکتا پھرا۔ پریشان کہ مجھے تو کربلا پہنچنا ہے۔ گلیوں میں کب تک بھٹکتا پھروں گا۔ آگے بڑھا تو رستہ بند۔ ارے یہ تو اندھی گلی ہے۔ اندھی گلی؟ ہمارے محلّہ میں تو کوئی اندھی گلی نہیں تھی۔ میں تو جانوں کہ پورے نگر ہی میں نہیں تھی۔ بہت پریشان ہوا کہ میں تو اندھی گلی میں آکر پھنس گیا۔ کیسے نکلوں گا۔ کیسے کربلا پہنچوں گا۔ پھر کیا دیکھوں کہ اندھی گلی غائب۔ پٹپڑی میدان۔ خالی سنسان۔ آدمی نہ آدم زاد۔ یا اللہ یہ کونسی جگہ ہے۔ ایک گنوار سر پہ گھاس کا گٹھر لیے گذر رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر پوچھا "مقدم کربلا کدھر ہے۔"

"کربلا؟ اچھا جہاں مسلے اپنے تعزیئے لے کے جاویں ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ وہی جگہ۔"

"لالہ کسی مسلے سے پوچھو۔ ویسے یو جگہ تو راون کی پٹپڑی ہے۔"

راون کی پٹپڑی۔ مگر وہاں تو املی کا ایک بہت اونچا پیڑ تھا۔ وہ کہاں گیا۔ سناہٹی دوپہروں میں گھومتے پھرتے ہم ادھر جاتے بھی تو بس دھرم شالہ تک جاکر رک جاتے۔ راون کی پٹپڑی کو دور سے دیکھتے کہ ایک سنسان ویران میدان ہے۔ نہ گھاس نہ

پودے نہ جھاڑی۔ بس درخت بھی ایک۔ میدان کے بیچوں بیچ کس طرح کھڑا تھا کہ لگتا تھا کہ راون کھڑا ہے۔ ہاں تو میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔ فوراً ہی یہاں سے پلٹ پڑتا ہوں۔ ارے یہ تو قیوما کی دکان آگئی۔ لو رستہ مل گیا۔ یہاں سے سیدھا جانے کی بجائے بائیں کو مڑ جاؤں تو پہلے گھوسیوں کی گلی آئے گی۔ پھر ٹوٹا مقبرہ۔ پھر پرانے قلعہ والا ٹیلہ ...... ارے مگر گھوسیوں والی گلی کہاں گئی۔ گھوسی کہاں گئے۔ میں حیران ہوتا ہوں۔ اسی ہنگام آنکھ کھل گئی۔

پھر جیسے وہیں پہنچا ہوا ہوں۔ پھر حیران ہوتا ہوں۔ ہاں یہ تو اکوں کا اڈا تھا۔ اور اسماعیل جوتے والے کی دکان۔ فرموں پہ کتنے بہت سے جوتے چڑھے رکھے رہتے تھے۔ اور اس کے ہاتھ میں رانپی ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ کالے اور بادامی چمڑے کی چمکیلی کترنیں آس پاس پڑی رہتیں۔ کہاں گئی وہ دکان۔ سپیرا بند پٹاری سامنے رکھے بین بجائے چلا جا رہا ہے۔ لوگ بچے بڑے گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں بھی ان میں رل مل کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ آخر پٹاری کھلتی ہے۔ دو کالے بھنور سانپ پھن پھیلا کر جھومنے لگتے ہیں۔ سوئی جیسی پتلی زبانیں کس تیزی سے باہر نکلتی ہیں۔ یہ تو میری طرف بڑھ رہی ہیں اور پھن پھیلتے بلند ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کتنے بلند ہوں گے۔ خوف سے میں سمٹتا چلا جاتا ہوں۔ اچانک میری نظر سامنے اس میلے کچیلے لڑکے پر پڑتی ہے جو سانپوں کو دیکھنے کی بجائے مجھے گھور رہا ہے۔ میں سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھتا ہوں اور وہاں سے چپکے سے کھسک لیتا ہوں۔ اور اچانک مجھے خیال آتا ہے کہ میرے پاس پاسپورٹ تو ہے ہی نہیں۔ پاسپورٹ کے بغیر میں یہاں گھوم رہا ہوں۔ بس ایک خوف مجھے آلیتا ہے اور اب مجھے اس لڑکے سے جو مجھے گھور رہا تھا زیادہ ڈر لگنے لگتا ہے۔ کیا اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔ میرے قدم زیادہ تیزی سے اٹھتے ہیں۔ اس نے مجھے کھسکتے ہوئے دیکھا تھا یا نہیں دیکھا تھا۔ کہیں میرا پیچھا نہ کر رہا ہو۔ چال اور

زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ گلی سے مڑ کر دوسری گلی میں سٹک لیتا ہوں۔ دوسری گلی سے تیسری گلی میں۔ سناٹا۔ آدمی نہ آدم زاد۔ دو گیڈر پیپل کے پاس چپ چاپ کھڑے مجھے تک رہے ہیں۔ پاؤں سو سو من کے ہو جاتے ہیں۔ بس آنکھ کھل جاتی ہے۔ اچھا ہی ہوا آنکھ کھل گئی۔ پتہ نہیں آگے چل کر کیا کچھ ہونا تھا۔ بس میں بچ گیا۔ کیونکہ ویزا اور پاسپورٹ قسم کی کوئی شے تو واقعی میرے پاس نہیں تھی۔ میرا تو روپ نگر پر ایک ہی حوالے سے حق ہے، کم از کم میری اپنی دانست میں۔ یہ کہ میں وہیں کی مٹی ہوں۔ وہاں میری نال گڑی ہے۔ مگر نال گڑے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اجی اگر آپ اپنے نگر کی مٹی ہیں تو ہوا کریں۔ اصل چیز تو ویزا ہے۔ ویزا کے بغیر تو نگر سے نکلا ہوا آدمی خواب میں بھی اس نگر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ تو اچھا ہی ہوا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ بس یہ ایک خواب تھا کہ آنکھ کھل جانے پر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ باقی تو ہمیشہ ہی افسوس ہوا کہ کمبخت آنکھ کیوں کھل گئی۔ سویا ہوا ہی پڑا رہتا تو اچھا تھا۔ بے شک اصحاب کہف کی نیند سے لمبی نیند ہو جاتی۔ کونسا میں ادارہ وطنی کا دکھ جھیل رہا تھا۔ اپنے ہی نگر کی گلیوں میں بھٹک رہا تھا نا۔ بھٹکتا رہتا۔ اچھا ہی تھا۔ اسی طرح تو خوابوں میں آوارہ گردی کر کے میں نے اپنے نگر کو جانا ہے۔ ورنہ جتنا میں نے وہاں رہتے ہوئے جاگتی آنکھوں سے دیکھ کر اس بستی کو جانا تھا وہ تو نہ جاننے کے برابر تھا۔ جاگتی آنکھوں سے آخر ہمیں کتنا نظر آتا ہے۔ چیزیں تو اپنا آپ خواب میں دکھاتی ہیں۔ اسی لیے تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ جو قیوما کی دکان' نام کی کہانی جس کسی نے لکھی تھی بہت تشنہ تھی۔ وہ کہانی تو مجھے لکھنی ہے اور اب لکھنی ہے جب میں پچاس برس تک اس بستی کو خوابوں میں خوب کھوند چکا ہوں۔

پچاس برس تھوڑے تو نہیں ہوتے۔ میرا مطلب ہے پچاس برس کے خواب۔ اتنے ہیں کہ اب تو ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ اس ایک خواب کو چھوڑ کر جس میں

میرے پاس پاسپورٹ نہیں تھا ہر خواب ایسا کہ بس اسے دیکھتے رہیے۔ جب بھی آنکھ کھلی افسوس ہی ہوا کہ آنکھ آخر کیوں کھل گئی۔ جاگنے پر تو عذاب ہی جھیلنے پڑتے ہیں سوئے رہنے میں بہت عافیت ہے۔ تو جب بھی آنکھ کھلتی افسوس ہوتا اور خوشی بھی ہوتی۔ خوشی یہ سوچ کر ہوتی کہ ایک رات کی نیند میں کتنا کچھ مل گیا۔ جیسے گود بھر گئی ہو۔ پھر افسوس ہوتا کہ کیا کچھ ملتے ملتے رہ گیا۔ ایک صبح تو جاگنے پہ میں بہت ہی تلملایا۔ جس رات میں نے بیلا کو دیکھا تھا۔ جیسے میں اپنے گھر گیا ہوں۔ کھلا پڑا تھا۔ خالی ڈھنڈار۔ ارے یاں پہ تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کہاں گئے سب۔ میں زینے پہ چڑھ کے اوپر والے کمرے میں جاتا ہوں۔ کھڑکی کھولتا ہوں جو پچھواڑے والی گلی میں کھلتی تھی اور سامنے ہی لالہ پیارے لال کا اونچا مکان کھڑا تھا۔ تو میں کھڑکی کھولتا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے بیلا چوبارے میں کھڑی اپنے بال سکھا رہی ہے۔ کیسی خوبصورت لگ رہی تھی۔ بیلا اتنی خوبصورت تو نہیں تھی۔ یہ تو جیسے کوئی پری ہو۔ پرستان سے اڑ کر لالہ پیارے لال کے چوبارے میں اتر آئی۔ جی میں آیا کہ کود کے واں پہ جاؤں اور چھو کے دیکھوں کہ یہ بیلا ہی ہے۔

میں ہونق بنا دیکھتا رہا۔ پھر پاس گیا۔ ''بیلا۔ تم بیلا ہو نا۔''

''نہیں، میں بیچا ہوں۔'' کھلکھلا کے ہنسی اور دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ اتنی دھاڑ سے بند ہوا کہ پٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔

پھر کبھی نظر نہیں آئی۔ بہت میں نے چاہا کہ پھر کسی شب اسے خواب میں دیکھوں۔ مگر خواب تو اپنی مرضی سے آتے ہیں اور اچانک آتے ہیں۔ اس کے بعد کتنی بار مجھے بیلا کا خیال آیا۔ اور ساتھ میں افسوس کہ ان دنوں کیوں پتہ نہ چلا کہ وہ اتنی خوبصورت ہے ورنہ میں اس کا منہ کیوں چڑاتا۔ جہاں وہ چوبارے میں آئی میں نے اسے دیکھ کے منہ چڑایا اور وہ ماں کو پکارتی ''ماں، یو مسلا میرا منہ چڑاوے ہے۔'' میں فوراً ہی

کھڑکی کے پیچھے چھپ جاتا۔

ایک دفعہ کیا ہوا کہ گلی میں چوپئی ہو رہی تھی۔ ہولی کے بعد گاؤں سے ٹولیاں ڈھول بجاتی ناچتی گاتی آیا کرتی تھیں۔ ہم انہیں چوپئی والے کہتے تھے۔ تو گلی میں چوپئی ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بھیڑ میں بیلا بھی کھڑی ہے۔ میں اس کے برابر آن کھڑا ہوا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا۔ وہ تو چوپئی کے ناچ گانے میں کھوئی ہوئی تھی۔ مجھے آج پہلی مرتبہ اس کے برابر کھڑے ہونے کا موقع ملا تھا۔ میں نے کتنے چاؤ سے کہا "بیلا۔" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ فوراً ہی بھڑک گئی "چل مسلا" اور یہ جا وہ جا۔

ایک خواب پر میں ہنسا بھی اور اداس بھی ہوا۔ جیسے ہم روپ نگر سے جا رہے ہیں۔ گلی کے آخر جا کر مڑنے لگتا ہوں تو میری نظر اپنی چھت کی منڈیر پہ جا ٹکتی ہے جو بارشوں آندھیوں کی مار کھا کھا کر کتنی کالی پڑ گئی تھی اور کتنی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ جیسے ایک چیل منڈیر پر گم سم بیٹھی ہے۔ اور ایک کٹی ہوئی پتنگ دور سے ڈولتی آ رہی ہے۔ اس کا لال مانجھا منڈیر کو چھوتا ہوا گذر رہا ہے۔ میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ اک مڑ جاتا ہے دم کے دم میں سیاہی مائل شکستہ منڈیر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

میں ہنسا۔ بھلا یہ کیا خواب تھا۔ وہ ہمارے جدی گھر کی کاہی آلود خستہ حال منڈیر تھی، الحمرا کا کنگرہ تو نہیں تھا۔ اور میں کونسا قرطبہ سے نکل رہا تھا۔ وہ روپ نگر ہی تو تھا۔ آہ سرد کے پیچھے بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ روپ نگر سے نکلنے والے کی آخری آہ سرد تاریخ میں جگہ نہیں بنا سکی۔ میں کتنا ہنسا۔ مگر پھر اداس ہو گیا اور وہ کاہی آلود خستہ حال منڈیر کتنی دیر تک میرے تصور میں منڈلاتی رہی۔ اور اس آن مجھے خیال آیا پھر شک میں پڑ گیا کہ واقعی میں نکل آیا تھا یا وہیں رہ گیا تھا۔ زمانے بعد پھر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔ وہ کاہی لگی ٹوٹی پھوٹی منڈیر کتنے خوابوں کے بعد جا کر مجھ پر منکشف ہوئی۔ اور پھر ویسی ہی اداسی۔ وہ ساری کٹی ہوئی پتنگیں دھیان میں منڈلانے لگی ہیں جو میں نے اس منڈیر پہ

کھڑے ہو کر لوٹی تھیں۔ اور وہ پتنگیں جو بالا ہی بالا گذر گئیں۔ ڈور اتنی اونچی جا رہی تھی کہ میں پکڑ ہی نہیں سکا۔ اور وہ پتنگیں جو میرے بعد اپنی لمبی ڈور کے ساتھ اس منڈیر کو چھوتی ہوئی گذری ہوں گی۔ انہیں بھی کسی نے لوٹا تو ہوگا۔ جو پتنگ کٹتی ہے وہ بہر حال لوٹی جاتی ہے۔ کٹی ہوئی پتنگ کا مقدر ہی یہ ہے۔ ایسی پتنگ تو کوئی کوئی ہوتی ہے جو لوٹنے والوں کی ندیدی نظروں اور بلند ہوتے ہاتھوں سے بچتی بچاتی کسی اونچے درخت کی ٹہنیوں میں جا کر آسودہ ہوتی ہے۔

خیر مجھے یہاں پتنگوں کے عروج و زوال کی داستان لکھنی مقصود نہیں۔ وہ تو لمبی بھی ہے اور عبرتناک بھی۔ نہ اپنے خوابوں کی پچاس سالہ تاریخ لکھنے کا منصوبہ ہے۔ وہ تو میں یوں بھی نہیں لکھ سکتا کہ پورا خواب کوئی ایک بھی یاد نہیں ہے۔ ہر خواب حافظہ میں اس طرح ابھرتا ہے جیسے پہلے بہت کچھ دیکھا چکا ہوں اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ بھی جیسے خواب ہو اور جیسے عقل و ادراک کے دائرے میں سے پھسلا جا رہا ہوں۔ بس اسی میں خواب ختم ہو جاتا ہے ختم کہاں ہوتا ہے۔ بس تحلیل ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی خواب کوئی مختصر افسانہ یا ناول تو ہوتا نہیں کہ اس کا کوئی خاص پلاٹ ہو' ایک نقطہ آغاز ہو اور ایک نتہا ہو۔ مگر میرے خواب کچھ زیادہ ہی انمل بے جوڑ ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے یہ جو میں نے پچھلے پچاس سال میں خواب دیکھے ہیں۔ ویسے لگتا ہے۔ یہ سب ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ اس کے باوجود کتنے بے ربط ہیں۔ وہ جو میں قیوما کی دکان والی کہانی کو پھر سے لکھنا چاہتا ہوں وہ بھی کہیں ایسی ہی بے ربط نہ ہو۔ اپنی باقاعدہ کہانی ہے ہی نہیں' بس جیسے خواب بیان ہو رہا ہے۔ ویسے تو یہ بڑی عبرتناک بات ہو گی کہ ایک جیتی جاگتی بستی خواب بن کر رہ جائے۔ کیونکہ روپ نگر تو پچاس برس پہلے بھی تھا' اب پچاس برس بعد بھی ہے۔ بلکہ اب زیادہ ہے۔ کیونکہ ان پچاس برسوں میں میرے خوابوں نے اسے بہت بنا سنوار دیا ہے۔ ان برسوں میں برصغیر کے دوسرے

شہروں نے صنعتی اور تجارتی اعتبارات سے ترقی کی ہے۔ ان میں نئے پلازا تعمیر ہوئے' نئے بازار آراستہ ہوئے' نئی کولونیاں' نئے فلیٹ' نئے بنگلے' مگر روپ نگر نے میرے خوابوں کے تعمیراتی منصوبے کے تحت ترقی کی ہے مطلب یہ ہے کہ یہ قیوما کے وقتوں کا روپ نگر نہیں ہوگا۔ اب یہ نگر اتنا بڑھ پھیل گیا ہے کہ اسے کہانی یا ناول کے چوکھٹے میں بیان کرنا مشکل ہوگا۔ بہر حال مجھے تو یہ کہانی پھر سے لکھنی ہے' پوری یا ادھوری۔ کیونکہ جیسا کہ لکھنے والا بتا چکا ہے کہ قیوما کی دکان لکھتے ہوئے وہ اصلی کردار کو تو بیان کرنا بھول ہی گیا تھا۔ جو کردار اس میں بیان ہوئے ہیں وہ تو سب ذیلی کردار تھے۔ قیوما خود ذیلی کردار نکلا۔ جب اس نے اپنی دکان بند کر دی اور اس نگر سے نکل گیا تو بس اسی آن وہ ذیلی کردار بن گیا۔

اس کہانی کا تو مرکزی کردار وہی آدمی ہے جو وہیں رہ گیا۔ اس وقت ہم میں سے کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ وہ ہمارے ساتھ وہاں سے نہیں نکلا۔ اس نے تو زمین پکڑی تھی۔ وہاں سے ہلا ہی نہیں۔ کہانی لکھتے وقت بھی لکھنے والے کو اس کا خیال نہیں آیا۔ بس وہ قیوما ہی کا ذکر کرتا رہا۔ وہ تو رفتہ رفتہ ہمیں خیال آیا کہ وہ جو ہم میں ایک شخص تھا وہ کہاں رہ گیا۔ اچھا وہ وہاں رہ گیا تو پھر وہ گیا کہاں۔ اس کی ٹھیک تو قیوما کی دکان کا تھڑا تھا۔ وہ دکان بند ہو گئی۔ پھر اس نے کوئی نیا ٹھکانا بنایا ہوگا۔ اس کا پتہ نہیں چل رہا۔ مجھے تو اس نگر کے سارے احوال کا پتہ اپنے خوابوں سے ملا ہے۔ مگر عجب ہوا کہ وہ ابھی تک میرے کسی خواب میں نہیں آیا۔ اور ایک وہی ہے جو میرے خواب میں نہیں آیا ورنہ اس نگر کا کون باسی ہے جو میرے خوابوں میں نہیں آیا اور تو اور بیلا بھی ایک مرتبہ خواب میں آکر مجھے اپنی چھب دکھا گئی۔ واہ کیا چھب تھی۔ بال سکھا رہی تھی۔ یہ لمبے لمبے بال۔ ایسے بال تو پریوں کے ہوتے ہیں اور اس کی بھری بھری گات۔ وہاں رہتے ہوئے تو میری آنکھوں پہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ میں اس کا منہ ہی چڑاتا رہا۔ نظر بھر

کے دیکھا ہی نہیں کہ وہ ہے کیا شے۔ خیر اگر دیکھ لیتا تو پھر یہ کہانی بیلا کی کہانی بن جاتی۔ چلو ٹھیک ہی ہوا۔ مگر وہ آدمی ابھی تک مجھے خواب میں کیوں دکھائی نہیں دیا۔

میں نے اپنے خوابوں میں دو ہی حوالوں سے مات کھائی ہے۔ ایک تو میں کبھی کربلا تک نہیں پہنچ پایا۔ اور دوسرے اس آدمی کو میں ابھی تک نہیں ڈھونڈ پایا۔ پچاس سال ہو گئے خوابوں میں بھٹکتے ہوئے۔ یہ میرے خواب ہیں یا چوتھا کھونٹ ہے۔ جہاں دیدہ بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ مہم جوئی سدا سے بادشاہوں کا شیوہ چلا آتا ہے۔ سو شوق سے مہم پہ جاؤ۔ مگر بوڑھا باپ جس نے گرم و سرد زمانہ بہت دیکھا تھا بیٹے کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ تینوں کھونٹ جائیو پر چوتھے کھونٹ میں قدم مت رکھیو کہ اس سفر میں مہم جویوں کے لیے خواری بہت ہے۔ آدمی کی جون تک بدل جاتی ہے۔ شہزادے نے نصیحت گرہ میں باندھی مگر ایک ہرن کا پیچھا کرتے کرتے وہ چوتھے کھونٹ میں داخل ہو گیا۔ ہرن تو اڑنچھو ہو گیا۔ اب حیران و پریشان شہزادہ تھا اور ہولا دینے والا نرجن بن۔ میرے خواب میرا نرجن بن ہیں۔ کب سے اس بن میں بھٹک رہا ہوں۔ مگر منزل مقصود اب بھی اتنی ہی دور ہے جتنی پہلے خواب میں دور تھی۔ کربلا کے مینار دکھائی دیتے ہیں مگر رستے میں ہوتا ہوں کہ خواب کا تار ٹوٹ جاتا ہے اور وہ کھویا ہوا آدمی۔ اس کی تو خبر ہی نہیں مل رہی ۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

مگر ایک عمر تو ہو گئی۔ پچاس سال ایک پوری عمر ہوتے ہیں۔ اب عمر دینے والے سے ایک اور عمر مانگنی پڑے گی۔ کربلا کتنی دور ہے۔ جو گم گیا ہے وہ کب ملے گا۔ وہ ایک خواب جو مستقل جل دے رہا ہے کب دکھائی دے گا۔ کب اس خواب کا جاگنے کے ساتھ ملاپ ہو گا۔ کب میں یہ کہانی لکھوں گا۔ یا اسی طور دائرے میں چکر کاٹتا رہوں گا۔

مورنامہ

اللہ جانے یہ بدروح کہاں سے میرے پیچھے لگ گئی۔ سخت حیران اور پریشان ہوں۔ میں تو اصل میں موروں کی مزاج پرسی کے لیے نکلا تھا۔ یہ کب پتا تھا کہ یہ بلا جان کو چمٹ جائے گی۔ وہ تو اتفاق سے اس چھوٹی سی خبر پر میری نظر پڑ گئی ورنہ اس ہنگامہ میں مجھے کہاں پتہ چلنا تھا کہ وہاں کیا واردات گذر گئی۔ ہندوستان کے ایٹمی دھماکہ کی دھماکہ خیز خبروں کے ہجوم میں کہیں ایک کونے میں یہ خبر چھپی ہوئی تھی کہ جب یہ دھماکہ ہوا تو راجستھان کے مور سراسیمگی کے عالم میں جھنکارتے شور مچاتے اپنے گوشوں سے نکلے اور حواس باختہ فضا میں تتر بتر ہو گئے۔

ویسے تو میں نے فوراً ہی ایک کالم لکھ کر اپنے دانست میں مور دوستی کا حق ادا کیا اور فارغ ہو گیا۔ مگر فارغ کہاں ہوا۔ اس چھوٹی سی خبر نے میرے ساتھ وہی کیا جو منوجی کے ساتھ ان کے ہاتھ آ جانے والی چھنگلیا جیسی مچھلی نے کیا تھا۔ وہ تو اسے گھڑے میں ڈال کر نچنت ہو گئے تھے مگر وہ پھیلتی چلی گئی۔ منوجی نے اسے گھڑے سے ناند میں' ناند سے کنڈ میں' کنڈ سے تلیا میں' تلیا سے ندی میں منتقل کیا مگر پھر وہ ندی میں بھی نہیں سمائی۔ پھر انہوں نے اسے اٹھا کر سمندر کا رخ کیا تو وہ چھوٹی سی خبر بھی یا وہ واقعہ جسے

اخبار والوں نے ایک کالمی سرخی والی دو سطری خبر سمجھا تھا' میرے تصور میں پھیلتی چلی گئی۔ آغاز ان موروں کی یاد سے ہوا جنہیں میں نے جے پور کے ایک سفر کے دوران دیکھا تھا۔ سبحان اللہ کیا ترشا ترشایا گلابی گلابی شہر تھا۔ اس شہر میں میں نے دوپہر میں قدم رکھا تھا۔ ان اوقات میں تو کسی وجود کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن جب دن ڈھلے میں نے اس دلہن ایسے سجے سجائے ریسٹ ہاؤس میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے پھیلے ہوئے صحن میں فوارے کے ارد گرد چبوترے پر منڈیروں پر مور ہی مور' کتنے سکون کے ساتھ اور کتنی خاموشی سے اپنی نیلی چمکیلی لمبی دموں کے ساتھ ایک شاہانہ وقار کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ ان کی اس چہل قدمی میں شاہانہ وقار کے ساتھ کتنی شانتی تھی۔ اس آن وہ سارا دیار مجھے شانتی کا گہوارہ نظر آیا۔ شانتی کا' حسن کا اور محبت کا۔

اگلی شام جب میں اس شہر سے نکلنے لگا تو جس ٹیلے' جس پہاڑی پر نظر گئی وہاں موروں کا یک جھرمٹ نظر آیا۔ اسی طرح خاموش۔ ان کی چہل قدمی میں وہی وقار' ویسی ہی شانتی' تھوڑی ہی دیر میں شام کا دھندلکا پھیل گیا اور پوری فضا موروں کی جھنکار سے لبریز ہو گئی۔ میں نے جانا کہ یہ مسافر نواز میری ہی خاطر یہاں اس پاس کے ٹیلوں اور درختوں پر اترے ہوئے تھے۔ اب وہ اپنے مہمان کو الوداع کہہ رہے ہیں۔

اور اب جب میں نے اس سفر کو یاد کیا تو میری ساری فضائے یاد موروں سے بھر گئی۔ اور میں حیران ہوا کہ اچھا وہاں اتنے موروں سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ جیسے راجستھان کے سارے مور میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے ہوں مگر اب وہاں کیا نقشہ ہوگا۔ میں دھیان ہی دھیان میں پھر اس دیار کی طرف نکل جاتا ہوں۔ میں حیران و پریشان بھٹکتا پھر رہا ہوں نہ کوئی مور دکھائی پڑ رہا ہے نہ ان کی جھنکار سنائی پڑ رہی ہے۔

وہ سب کہاں چلے گئے۔ کس کھوہ میں جا چھپے۔ دور ایک ٹیلے پر نظر گئی۔ ایک

نچا کھسٹا مور بیٹھا دکھائی دیا۔ میں تیز قدم اٹھاتا اس طرف چلا۔ مگر میرے پہنچنے سے پہلے اس نے ایک ہراس آمیز آواز نکالی' اڑا اور فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ مور اڑ کر کدھر گیا۔ یہاں اکیلا بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ اس کے سنگھی ساتھی' موروں کے جھرمٹ کے جھرمٹ' وہ سب کہاں گئے۔ وہ اس طرح ویرانی کی تصویر بنا کیوں نظر آ رہا تھا۔ اتنا اجڑا اجڑا' اتنا نچا کھسٹا کیوں نظر آ رہا تھا۔ ویرانی کی اس تصویر سے میرا دھیان ویرانی کی ایسی ہی ایک اور تصویر کی طرف چلا گیا جسے میں بھلا بیٹھا تھا اور جو اس وقت اچانک میرے تصور میں ابھر آئی تھی۔ سمندر کے شفاف پانی میں گھلتا ہوا گاڑھا گاڑھا پٹرول' پانی کی رنگت بدلتی چلی جا رہی ہے۔ پٹرول کی آلودگی سے کچھ سیاہی مائل نظر آ رہا ہے اور اجاڑ ساحل پہ ایک اکیلی مرغابی اس آلودہ پانی میں نہائی ہوئی ساکت بیٹھی حیرت سے سمندر کو تک رہی ہے۔ جو پانی کل تک اس کے لیے امرت کا مرتبہ رکھتا تھا آج زہر بن گیا ہے۔ اس کے پر بھاری ہو گئے ہیں کہ اب وہ اڑنے جوگی نہیں رہی اور زہر جیسے نس نس میں اتر گیا ہو۔ عراق امریکہ جنگ کی ساری ہولناکی اس آن میرے لیے اس مرغابی میں مجسم ہو گئی تھی۔ مجھے دکھ ہوا کہ یہ مرغابی اس وقت کتنی اذیت میں ہے اور حیرانی ہوئی کہ آدمیوں نے اس ہنگام جو کچھ ایک دوسرے کے ساتھ کیا' صدام حسین نے عراقیوں کے ساتھ' عراقیوں نے کویتیوں کے ساتھ' امریکہ نے عراقیوں کے ساتھ اس سارے عذاب کو اس غریب مرغابی نے اپنی جان پر لے لیا ہے۔ عجب بات ہے جب پیمبری وقت پڑتا ہے تو بڑے بڑے جان بچا کر نکل جاتے ہیں۔ کوئی ننھی سی جان اذیت کے اس بار گراں کو اکیلی سہار لیتی ہے۔ اس گھڑی وہ مرغابی مجھے ایک جلیل القدر داستانی پرندہ نظر آئی۔ جیسے اس میں کسی پیغمبر کی روح سما گئی ہو کہ اس زور پر اس نے انسانی امت کا سارا عذاب ایک امانت جان کر اپنے کاندھوں پر لے لیا ہے۔

میری کم نظری تھی کہ میں نے اس مرغابی کے مرتبہ کو نہیں پہچانا۔ احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ مرغابی تو ایک پیمبرانہ شان رکھتی ہے۔ ہمارے عہد کی علامت ہے آدمی اس زمانے میں جو آدمی کے ساتھ کر رہا ہے اور اپنے زعم آدمیت میں جو کچھ فطرت کے ساتھ کر رہا ہے، یہ اس سب کی کہانی سنا رہی ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ مجھے اس پر کہانی لکھنی چاہیے۔ کتنی آسانی سے میں نے اس مرغابی کو فراموش کر دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بیچاری صرف مرغابی تھی۔ اور مور جن پر میں کہانی لکھنے کے لیے بے چین ہوں صرف مور نہیں ہیں۔ فرض کرو کہ اس مرغابی کی جگہ کوئی راج ہنس ہوتا۔ راج ہنس، مگر راج ہنس اب اس دنیا میں کہاں ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اس برصغیر کی دھرتی پر دو پرندے راج کرتے تھے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ پرندوں کا راجہ کون ہے، راج ہنس یا مور۔ اب وہ راج ہنس کہاں ہیں اور وہ موتی ایسی جھیلیں کہاں ہیں جہاں وہ اترا کرتے تھے اور وہ راجکماریاں کہاں ہیں جو اپنے محل کی فصیل پر اتر آنے والے راج ہنس پر عاشق ہو جایا کرتی تھیں اور اسے اپنے آنگن میں اتارنے کے لیے اپنی مالا کے موتی بکھیر دیا کرتی تھیں۔ وہ راج ہنس موتی چگتے تھے اور مانسروور جھیل کے شفاف پانی میں تیرا کرتے تھے۔ اب مانسروور جھیل کہاں ہے۔ لگتا ہے کہ سب جھیلیں خشک ہو گئیں۔ ندیوں کا پانی میلا ہو گیا۔ فضا بارود، دھوئیں، خاک دھول سے اٹی ہوئی ہے۔ نعروں اور دھماکوں کے شور سے آلودہ ہے۔ راج ہنس پاکیزہ فضا اور شفاف پانیوں کی تلاش میں کہیں دور نکل گئے۔ پیچھے بس مرغابیاں اور قازیں رہ گئیں۔ زمانے کا عذاب وہ سہتی ہیں راج ہنس قصہ کہانیوں کی دنیا میں پرواز کرتے ہیں۔

ایک مور تھا جو ابھی تک اپنے طاؤسی وقار کے ساتھ ٹکا ہوا تھا اور ماضی اور حاضر کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب بھی باغوں سے اس کی جھنکار اس طرح آتی ہے جیسے ماضی قدیم سے دیومالائی زمانوں سے تیرتی ہوئی آ رہی ہے۔ راجستھان میں

تو مور کی کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ میں کھنچا چلا جاتا ہوں۔ راجستھان بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ میری بستی ہے۔ ساون بھادوں کی بھیگی شاموں میں وہ کتنا غل مچاتے تھے۔ وہ تو بستی کے باہر باغ باغیچوں میں جھنکارتے تھے مگر ان کی جھنکار سے ساری بستی گونجتی تھی۔ اور وہ ایک مور جو جانے کدھر سے اڑتا اڑتا آیا اور ہماری منڈیر پر بیٹھ گیا۔ کتنی دیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میں دبے پاؤں چھت پہ گیا۔ پیچھے سے سرکتے سرکتے منڈیر تک گیا۔ اس کی دم پکڑنے ہی کو تھا کہ اس نے جھرجھری لی اور فضا میں تیر گیا۔

"میرے لال، مور کو تنگ نہیں کیا کرتے، یہ جنت کا جانور ہے۔" نانی اماں نے مجھے سرزنش کی۔

"جنت کا جانور۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "پھریاں یہ کیا کر رہا ہے؟"

"ارے بیٹا، اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔"

"نانی اماں، کیا کیا تھا مور نے جو سزا بھگت رہا ہے۔"

"ارے بیٹا، معصوم تو ہے ہی شیطان کی چال میں آ گیا۔"

"کیسے آ گیا شیطان کی چال میں۔"

"وہ کم بخت بڈھا پھونس بن کے جنت کے دروازے پہ پہنچا۔ بہت منتیں کیں کہ دروازہ کھولو۔ جنت کے دربان بھانپ گئے کہ یہ نحوست مارا تو شیطان ہے۔ انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ مور جنت کی منڈیر پر بیٹھا یہ دیکھ رہا تھا۔ اسے بڈھے پہ بہت ترس آیا۔ اڑ کر نیچے آیا اور کہا کہ بڑے میاں میں تمہیں جنت کی دیوار پار کرائے دیتا ہوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ شیطان فوراً ہی مور پہ سوار ہو گیا۔ مور اڑا اور اسے جنت میں اتار دیا۔ اللہ میاں کو جب پتہ چلا تو انہیں بہت غصہ آیا۔ باوا آدم اور اماں حوا کو جنت سے نکالا تو مور کو بھی نکال دیا کہ جاؤ لمبے بنو۔"

میں کتنا حیران ہوا تھا۔ بیچارہ مور۔ جنت کی منڈیر پر بیٹھا کرتا تھا۔ اب ہماری منڈیر پر آکے بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے نانی اماں سے کہا تو کہنے لگیں "ہاں بیٹے' اپنی منڈیر چھٹ جائے تو یہی ہوتا ہے۔ اب تیری میری منڈیروں پہ بیٹھتا ہے اور کہیں جو ٹک کے بیٹھ جائے۔"

منڈیروں' درختوں کے جھنڈ میں' ٹیلے پہ' جہاں بھی پنجے ٹکانے کو جگہ مل جائے' میں جب شرادستی کی راہ سے گذرا تھا تو میں نے اسے ایک ہرے بھرے ٹیلے پہ بیٹھے دیکھا تھا۔ کسی دھیان میں گم یا جیسے چپ چاپ کسی کی راہ تک رہا ہے۔ میں شرادستی بہت دیر سے پہنچا تھا۔ مہاتما بدھ کتنی برساتوں پہلے یہاں سے سدھار چکے تھے۔ اب وہ ٹھکانا بھی یہاں نہیں تھا' جہاں وہ برسات کے دنوں میں آکر باس کیا کرتے تھے۔ بس اب تو اس بستی سے یادگار تھوڑی اینٹیں پڑی رہ گئی تھیں۔ ذرا ہٹ کے ایک ہرے بھرے شاداب ٹیلے پر شاید اسی سمے کا ایک مور بیٹھا رہ گیا تھا جو گئے سمے کو اس سمے کی شرادستی کو اپنی آنکھوں میں رمائے بیٹھا تھا۔ اور کتنے سکون سے بیٹھا تھا۔ اس ایک دم سے اجڑی ہوئی شرادستی کی ساری فضا میں جیسے شانتی رچ گئی تھی۔

میں شرادستی میں زیادہ دیر نہیں رکا۔ مجھے واپس دلی پہنچنا تھا۔ دلی کی وہ شام بہت اداس تھی۔ کم از کم بستی نظام الدین میں تو اس کا یہی رنگ تھا۔ ابھی پچھلے دنوں کتنے خانہ برباد قافلہ در قافلہ یہاں سے نکلے تھے۔ اب خاموشی تھی۔ اور برسات کی یہ شام بستی نظام الدین میں کچھ زیادہ ہی خاموش تھی۔ کچے احاطے کے بیچ غالب کی قبر اجڑی اجڑی تھی۔ احاطے کے گرد کتنی اونچی اونچی گھاس کھڑی تھی۔ اس بیچ سے میں گذر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک مور نے مجھے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دکھائی تو نہیں دے رہا تھا مگر اس کی پکار پھر سنائی دی۔ عجب پکار تھی جیسے ہزار صدیاں مل کر مجھے پکار رہی ہوں۔

ہزار صدیوں کے کنارے پر پہنچ کر میں ٹھٹکا۔ اس مور کی آواز تو مجھے یہیں تک لے کر آئی تھی مگر اب صدیوں کے اس پار سے موروں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ میں حیران 'یا مولا' یہ مور کون سے باغ سے بول رہے ہیں۔ میں نے قدم بڑھایا اور ایک نئی حیرانی نے مجھے آلیا۔ یہ کون سا نگر ہے۔ فصیلیں بادلوں سے باتیں کرتی ہوئی۔ فصیلوں کے گرداگرد پھیلے ہوئے باغ، قسم قسم کے پھل۔ رنگ رنگ کی چڑیاں' باغ چڑیوں کی چہکار سے گونج رہے ہیں۔ ساری چہکار پر چھائی ہوئی دو آوازیں۔ کوئل کی کوک اور موروں کی جھنکار۔ ارے' یہ تو پانڈوؤں کا نگر ہے۔ اندرپت۔ یہ تو میں بہت دور نکل آیا۔ مجھے واپس چلنا چاہیے۔

بہت گھوم پھر لیا۔ بہت موروں کو دیکھ بھال لیا۔ کن کن وقتوں کے کس کس نگر کے موروں کو دیکھا۔ ان کی جھنکار سنی۔ اب مجھے مورنامہ لکھنا چاہیے مگر مجھے گھر واپس ہونے سے پہلے راجستھان کا پھر ایک پھیرا لگا لینا چاہیے۔ شاید وہ مور جو سراسیمگی کے عالم میں یہاں سے اڑ گئے تھے 'واپس آ گئے ہوں۔

مور واقعی اچھی خاصی تعداد میں واپس آ گئے تھے۔ مگر عجب ہوا کہ مجھے دیکھ کر وہ سخت ہراساں ہوئے اور چیختے چلاتے ٹیلوں اور درختوں کی شاخوں سے اڑے اور فضا میں تتر بتر ہو گئے۔ بس اسی آن مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ کوئی دوسرا میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ میں نے اپنے بائیں نظر ڈالی۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہیں یہ تو اشوتھاما ہے۔ کوروکشیتر کا مہاپاپی۔ یہ یہاں کہاں اور میرے ساتھ کیوں چل رہا ہے۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ میرے ساتھ لگ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جب میں اندرپرستھ سے پلٹا ہوں تو کوروکشیتر کے پاس سے گذرا تھا' وہیں سے یہ منحوس شخص میرے ساتھ ہو لیا ہو گا مگر کوروکشیتر میں تو اب سناٹا تھا۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ یہ وہاں کیا کر رہا تھا۔ کیا تب سے وہیں بھٹک رہا ہے۔

جنگ آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ اشو تھاما کو دیکھو اور عبرت پکڑو۔ درونا چاریہ کا بیٹا، باپ نے وہ عزت پائی کہ سارے سورما کیا کورو کیا پانڈو، اس کے سامنے ماتھا ٹیکتے تھے، چرن چھوتے تھے۔ بیٹے نے باپ سے ورثے میں کتنا کچھ پایا۔ مگر یہ ورثہ اسے پچا نہیں۔ اس جنگ کا سب سے ملعون آدمی آخر میں یہی شخص ٹھہرا۔

کہتے ہیں کہ سورماؤں کے استاد درونا چاریہ کے پاس وہ خوفناک ہتھیار بھی تھا جسے برہم استر کہتے ہیں۔ دیکھنے میں گھاس کی پتی، چل جائے تو وہ تباہی لائے کہ دور دور تک جیو جنتو کا نام و نشان دکھائی نہ دے۔ بستی زد میں آ جائے تو دم کے دم میں راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ درونا نے اس ہتھیار کا راز بس اپنے ایک ہی چیلے سورما کو منتقل کیا تھا۔ ارجن کو جو اس کا سب سے چہیتا چیلا تھا۔ جنگ بھی کیا ظالم چیز ہے۔ کوروکشیتر کے میدان میں استاد اور چیلا ایک دوسرے کے مقابل لڑ رہے تھے مگر دونوں نے قسم کھائی تھی کہ برہم استر استعمال نہیں کرنا ہے کیونکہ اس کے چلنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔

درونا نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے اشو تھاما کو برہم استر کا گر سمجھا دیا تھا مگر سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی حال میں اسے استعمال کرنا نہیں ہے مگر جب درونا جنگ میں مارا گیا تو اشو تھاما کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جنگ کے آخری لمحوں میں وہ جان پہ کھیلا اور برہم استر چلا دیا۔ جنگ کے آخری لمحوں سے ڈرنا چاہیے۔ جنگ کے سب سے نازک اور خوفناک لمحے وہی ہوتے ہیں۔ جیتنے والے کو جنگ کو نبٹانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہارنے والا جی جان سے بیزار ہوتا ہے۔ تو وہ خوفناک ہتھیار جو بس دھمکانے ڈرانے کے لیے ہوتے ہیں، آخری لمحوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر بیشک شہر جل کر ہیروشیما بن جائے دل کی حسرت تو نکل جاتی ہے۔ جنگ کے آخری لمحوں میں دل کی حسرت کبھی جیتنے والا نکالتا ہے، کبھی ہارنے والا۔ کوروکشیتر میں آخر میں دل

کی حسرت اشو تتھامانے نکالی اور برہم استر پھینک مارا۔

تب سری کرشن ارجن سے بولے "ہے جناردھن، درونا کے مورکھ پتر نے تو برہم استر پھینک مارا۔ مجھے جیو جنتو سب نشٹ ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس استر کا توڑ تیرے پاس ہے۔ سو جلدی توڑ کر اس سے پہلے کہ سب کچھ جل کر بھسم ہو جائے۔"

تب ارجن نے اپنا برہم استر نکالا اور اشو تتھاما کے توڑ پر اسے سر کیا۔ اور کہتے ہیں کہ جب ارجن کا بان چلا تو ایسی بڑی آگ بھڑکی کہ تینوں لوگ اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آگئے۔ اس کی دھمک اس بن تک بھی پہنچی جہاں ویاس رشی بیٹھے تپ کر رہے تھے۔ انہوں نے تپسیا بیچ میں چھوڑی۔ ہڑبڑا کر اٹھے اور اڑ کر کورو کشیتر پہنچے۔ اشو تتھاما اور ارجن کے بیچ آن کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چلائے کہ ڈشٹو یہ تم نے کیا انیائے کیا۔ ساری سرشٹی جل کر بھوبھل بن جائے گی۔ جیو جنتو کا وناش ہو جائے گا۔ اپنے اپنے استر واپس لو۔

ارجن نے اس مہان آتما کے چرن چھوئے۔ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور فوراً ہی اپنا استر واپس لے لیا۔

پر اشو تتھاما ڈھٹائی سے بولا کہ "ہے مہاراج، میں نے تو استر چلا دیا۔ اسے واپس لینا میرے بس میں نہیں ہے۔ بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اس کی سیما بدل دوں۔ سو اب یہ استر پانڈوؤں کی سینا پہ نہیں گرے گا، پانڈوؤں کی استریوں پہ گرے گا جسے گربھ رہا ہے اس کا گربھ گر جائے گا جس کی کوکھ میں بچہ پل رہا ہے وہ بچہ مر جائے گا۔ پانڈو سنتان کا اس پرکار انت ہو جائے گا۔"

اس آن سری کرشن جی کلس کر بولے: "ہے درونا کے پاپی پتر، تیرا وناش ہو۔ تو نے بالک ہتیا کا پاپ کیا ہے۔ میں تجھے شاپ دیتا ہوں کہ تو تین ہزار برس اس طور جئے

گا کہ بنوں میں اکیلا مارا مارا پھرے گا۔ تیرے زخموں سے سدا خون اور پیپ ایسی رسا کرے گی کہ بستی والے تجھ سے گھن کھائیں گے اور دور بھاگیں گے۔"

میں بھی تو اس سے دور ہی بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ تو سائے کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ یا اللہ میں کدھر جاؤں' کیسے اس نحوست سے اپنا پیچھا چھڑاؤں۔ اچانک ایک خیال آیا کہ میرا بائی کی سادھی یہیں کہیں ہے۔ وہاں جا کر چھپ جاؤں۔ پھر یاد آیا کہ ارے ہاں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ بھی تو اسی نواح میں ہے۔ اگر اس درگاہ میں پہنچ جاؤں تو پھر تو سمجھو کہ اس کی زد سے بچ گیا۔ وہاں درگاہ میں اسے کون گھسنے دے گا۔ بس اس طرح کے خیال مجھے آرہے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے آنکھ بچا کر کیسے نکلوں' جس راہ جاتا وہ پرچھائیں کی طرح ساتھ ساتھ چلتا۔ ادھر موروں نے شور مچا رکھا تھا۔ کتنی ہراس بھری آوازوں میں چلّا رہے تھے' یعنی وہ مور جو بچے رہ گئے تھے۔ ادھر پانڈوؤں کے گھروں سے عورتوں کے بین کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ وہاں مرے ہوئے بچے پیدا ہو رہے تھے اور ارجن کے گھر میں تو قیامت مچی ہوئی تھی۔ سبھدرا کس درد سے بین کر رہی تھی۔ اس کی کوکھ کا جنا ابھی منیو پہلے ہی کوروکشیتر میں کھیت ہو چکا تھا۔ اسے رو دھو کر اس نے بہو سے آس لگائی تھی کہ وہ پوت جنے گی۔ اس پوت سے ارجن کے اندھیرے گھر میں اجالا ہو گا اور پانڈوؤں کی سنتان آگے چلے گی مگر ہوا وہ جو اشو تتھاما نے کہا تھا۔ اترا بیہوش پڑی ہے۔ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے۔ پانڈوؤں کے کسی گھر میں اب اجالا نہیں ہو گا۔ برہم استر نے ان کی استریوں کی کوکھوں کو اجاڑ ڈالا ہے۔ مگر سبھدرا نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ بھائی کا وعدہ اسے یاد ہے۔ کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ بھینا' تیری بہو کی کوکھ کو اجڑنے نہیں دوں گا۔ تو لو انہوں نے اوتار ہونے کے ناتے مردہ بچے میں جان ڈال دی ہے اور بتا دیا ہے کہ یہ بالک بڑے ہو کر ہستنا پور کے سنگھاسن پہ بیٹھے گا۔

پانڈووں کا نام روشن کرے گا۔ مگر اس مرے ہوئے بچے نے زندہ ہو کر عجب سوال کیا۔ جب سنگھاسن پہ بیٹھا اور ویاس جی اشیر واد دینے کے لیے بنوں سے نکل کر آئے اور اس کے دربار میں براجے تو اس نے گلاب کیوڑے کے پانی سے چلمچی میں ان کے پاؤں دھوئے۔ پھر چرن چھوئے اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ ''میرے پرکھ' آ گیا ہو تو ایک پرشن پوچھوں۔''

''پوچھ بیٹھا۔''

''ہے مہاراج' کورو کشیتر میں میرے سب ہی بڑے موجود تھے' ادھر بھی اور ادھر بھی۔ اور دونوں ہی طرف گنی گیانی بدھیمان موجود تھے۔ پھر انھیں یہ سمجھ کیوں نہ آئی کہ یدھ مہنگا سودا ہے۔ سب کچھ اجڑ جائے گا' وناش ہو جائے گا۔''

ویاس جی نے لمبا ٹھنڈا سانس بھرا' بولے ''پتر' یدھ میں اچھے اچھے مانو کی مت ماری جاتی ہے۔ اور ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔''

اور رشی جی ترنت اٹھ کھڑے ہوئے۔ جن بنوں سے آئے تھے الٹے پاؤں انہیں بنوں میں چلے گئے۔''

رشی لوگ ان بھلے وقتوں میں ہزاروں برس کے حساب سے زندہ رہتے تھے۔ ارجن کا پوتا رشی نہیں تھا' اسے سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گیا مگر اس نے ویاس جی سے جو سوال کیا تھا اس سوال نے ویاس جی سے زیادہ عمر پائی۔ میں جب راجستھان میں بھٹک رہا تھا تو یہ سوال مجھے ملا تھا' جہاں اشوتاما بھٹکتا پھر رہا تھا وہاں یہ سوال بھی آس پاس بھٹکتا دکھائی دیا۔ اس نے بھی میرا بہت پیچھا کیا۔ یہ سمجھ لو کہ میں دو سایوں کے بیچ چل رہا تھا۔

پہلے میں اشوتھاما کو دیکھ کے حیران ہوا تھا کہ اچھا اس مورکھ کے ابھی تین ہزار برس پورے نہیں ہوئے ہیں۔ پھر جب پر یکشت والے سوال سے مڈھ بھیڑ ہوئی

تو میں اور حیران ہوا کہ اچھا یہ سوال بھی ابھی تک چلا آ رہا ہے۔

بلکہ مجھے لگا کہ اب یہ سوال زیادہ گمبھیر ہو گیا ہے۔ مانو پوری پاک بھارت دھرتی پر منڈلا رہا ہے جیسے کسی کے سر پر تلوار لٹکی ہوئی ہو۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ یہ جواب تو نہ ہوا' ویاس جی نے سوال کو ٹالا تھا' جواب نہیں دیا تھا' تب ہی تو وہ تب سے فضا میں بھٹکتا پھر رہا ہے اور جواب مانگ رہا ہے۔ یک نہ شد دو شد۔ میری جان کے لیے وشو تتھاما کم تھا کہ یہ سوال بھی میری جان کو لگ گیا۔

خیر میں پہلے وشو تتھاما سے تو اپنی جان چھڑاؤں۔ کتنی مرتبہ اسے غچہ دینے کی کوشش کی۔ اچانک راہ بدل کر دوسری راہ پر ہو لیا۔ سمجھا کہ اسے پتہ نہیں چلا مگر تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ وہ تو پھر میرے آس پاس چل رہا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ میرا کتنا پیچھا کرے گا مجھے تو اپنے دیار واپس چلے جانا ہے۔ یہ اس دیار کی مخلوق ہے۔ حد سے حد سرحد تک میرا پیچھا کرے گا۔ آگے اسے کون جانے دے گا۔ پھر بھی میں نے کوشش کی کہ اس سے آنکھ بچا کر نکل جاؤں۔ بعد میں اسے پتہ چلے کہ میں یہاں سے نکل گیا ہوں اور اس کی زد سے باہر ہوں۔

میں واقعی اس سے آنکھ بچا کر نکل آیا تھا۔ کیسی تڑی دی۔ اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلا کہ میں کب وہاں سے نکلا اور کب سرحد پار کی۔ اپنی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بدروح سے میں نے نجات پائی۔ مجھے بیتال پچیسی کی کہانی یاد آئی مگر وہ تو کہانی تھی۔ اس طرح تو کہانیوں ہی میں بھوت جان کو چمٹا کرتے ہیں مگر میرے ساتھ تو واقعی ایسا ہوا۔ خیر بلا سے پیچھا چھوٹا۔ اب میں نچنت تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں اب جگ جگ کے موروں سے مل لیا ہوں۔ کس کس نگر کے مور کی جھنکار سنی ہے۔ اب میں اطمینان سے گھر بیٹھ کر مور نامہ لکھوں گا۔ دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ جن جن موروں کو دیکھا تھا وہ سب ایک دم سے میرے تصور

میں منڈلانے لگے۔ ان کی شیریں جھنکار سے میرا سامعہ گونج گیا۔ پھر مجھے لگا کہ جیسے میں جگت مور کے سائے میں چل رہا ہوں۔ جگت مور جس کی دم کھڑی ہو کر پنکھے کی شکل بن گئی ہے اور ساری فضا پر محیط ہو گئی ہے۔ جگت مور رقص کر رہا ہے۔

میں جب اپنے گھر کے قریب پہنچا ہوں تو اچانک مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ کا احساس ہوا۔ جیسے کوئی دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ میں نے دفعتاً پلٹ کر دیکھا اور میرے قدم سو سو من کے ہو گئے۔ اشو تھا میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یہ کم بخت تو یہاں بھی آ گیا۔ اب میں کیسے اس سے چھٹکارا پاؤں گا۔

تب میں رویا اور میں نے گڑگڑا کر پالنے والے سے پوچھا کہ اے مرے پالنے والے' اے مرے ربّ' اس پریت کے تین ہزار سال آخر کب پورے ہوں گے۔ کب میں اپنا مورنامہ لکھ پاؤں گا۔

شہرزاد کی موت

شہر زاد نے ایک ہزار ایک راتوں میں خیر سے ہزار سے اوپر کہانیاں سنائیں اور تین بیٹے جنے۔ کہنے والے کا بھلا' سننے والے کا بھلا' کہنے والی شہر زاد جس کی ان کہانیوں کے صدقے میں جان بخشی ہوئی اور اس کے صدقے میں سلطنت کی ان اَن گنت کنواریوں کی جانیں بچ گئیں جنہیں باری باری ایک رات کی ملکہ بننا تھا اور صبح ہوئے پر ان کا سر قلم ہونا تھا۔ سننے والوں میں دنیا زاد اور بادشاہ شہریار جس کی ان کہانیوں نے کایا کلپ کر دی۔ عورت ذات کی طرف سے دل پر جو میل آ گیا تھا وہ دھل گیا۔ سو وہ جو اس نے وطیرہ پکڑا تھا کہ روز رات کو ایک دوشیزہ سے بیاہ رچایا اور صبح کو اس کا سر اڑوا دیا' اس سے اس نے توبہ کی۔

اس خوشی میں سلطنت میں جشن منایا گیا۔ شہر کی آرائش ہوئی۔ سدابرت لگ گئی۔ رعیت نہال ہو گئی۔ مگر شہر زاد کا یہ حال تھا کہ بھوچکی ہو کر ارد گرد دیکھتی تھی کہ شب و روز اچانک کیسے بدل گئے۔ ایک ہزار ایک راتوں والی خون بھری فضا جب وہ موت کے سائے میں کہانی سنایا کرتی تھی اس پر ایسی چھا گئی تھی کہ اس سے نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔ اور جب اسے تھوڑا اعتبار آیا کہ وہ راتیں واقعی گذر گئی ہیں تو اسے ایک

حیرت نے آلیا۔ سوچتی تھی اور حیرت کرتی تھی کہ اچھا میں نے اتنا لمبا رتجگا کیا تھا اور اتنی کہانیاں سنائی تھیں۔ اتنی کہانیاں مجھے سوجھیں کہاں سے۔ غیب ہی سے آئی ہوں تو آئی ہوں۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ ایک رات دنیازاد کو اپنے پاس بٹھایا اور بولی: "اے میری بہن دنیازاد' اب میں سوچتی ہوں تو میری عقل چکرا جاتی ہے۔ ایک ہزار ایک راتیں میں نے کہانیاں کہہ کہہ کر کاٹ دیں۔ کچھ تو ہی مجھے سمجھا کہ یہ سب ہوا کیسے؟"

دنیازاد بولی: "اے میری ہمشیرۂ ہزار داستان' میں تو خود دریائے حیرت میں غرق ہوں کہ میری بہن کے حافظہ میں کہانیوں کا اتنا بڑا خزانہ دبا ہوا تھا۔ عزیز بہن' ویسے تو وہ راتیں خوف کی راتیں تھیں' دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ صبح چڑھے گی تو کیا گل کھلائے گی۔ موت مستقل اس پاس منڈلاتی نظر آتی تھی مگر یہ کالی ڈراونی راتیں' اے میری عزیز بہن' تیری کہی ہوئی کہانیوں سے جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ جب کہانی شروع ہو جاتی تھی تو پھر پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کتنی رات گئی اور کب ختم ہوئی اور بادشاہ کا یہ حال کہ مبہوت بیٹھا سنتا رہتا تھا۔"

شہرزاد بولی: "بہنوں' مجھے تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا' بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کہانی کہنی ہے اور زندہ رہنا ہے۔ پھر کہانیوں میں میں ایسی کھو گئی کہ زندہ رہنے کا خیال بھی پیچھے چلا گیا۔ لے دے کے ایک ہی لگن لگی رہتی تھی کہ جو کہانی شروع کی ہے اسے انجام تک پہنچانا ہے۔"

"سو بی بی وہ انجام کو پہنچ گئی۔ اور کیا خوب انجام کو پہنچی کہ بادشاہ کی کایا ہی بدل گئی۔ کہاں عورت ذات سے اتنی نفرت کہ روز ایک نسوانی سر قلم ہوتا تھا۔ کہاں اب وہ تمہارے پیر دھو دھو کے پیتا ہے۔"

پھر دونوں نے مل کے ان راتوں کے خوف و اندیشہ کو اور دکھ درد کو یاد کیا اور خوب روئیں۔ پھر آنسو پونچھے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مصیبت کی گھڑیاں کٹ گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے کہانیاں کہنے کی توفیق عطا کی اور ان کہانیوں کے طفیل جان بچی۔

دنیا زاد کی باتیں سن کر کچھ رو دھو کر شہر زاد کا جی ہلکا ہو گیا۔ اب جشن بھی تمام ہو چکا تھا۔ سلطنت کا کاروبار معمول کے مطابق چلنے لگا۔ ایک ہزار ایک راتیں بھی قصہ ماضی بن چلی تھیں۔ شہر زاد بادشاہ شہریار کی چہیتی ملکہ اور تین ہونہار شہزادوں کی ماں بن کر محل میں راج کرنے لگی۔ دنیا زاد نے بہن کی چاہت میں شادی بیاہ کا خیال دل سے نکالا۔ بس بہن کا سایہ بن کر محل میں رہنے لگی۔

بیٹے بڑے ہوئے۔ دھوم سے ان کی شادیاں ہوئیں۔ چاند سی بہوئیں گھر میں آئیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں باری باری ان کی کوکھ ہری ہوئی۔ پھول سی بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ یہ بچیاں جب ذرا بڑی ہوئیں تو دنیا زاد نے دیکھا کہ ان کا جی کھیل کود میں کم اور کہانیاں سننے میں زیادہ لگتا ہے۔ ان کا یہ شوق دیکھ کر ان سے کہا کہ بچیو' کہانیاں سننے کا تمہیں ایسا ہی شوق ہے تو اپنی دادی سے سنو۔ کہانی سنانے میں ان کا دنیا کے پردے پر کوئی ثانی نہیں۔

یہ سن کر تینوں بچیاں شہر زاد کے گرد اکٹھی ہو گئیں اور لگیں ضد کرنے کہ ہم تو آپ سے کہانی سنیں گے۔

بچیوں کی ضد دیکھ کر شہر زاد بہت سٹپٹائی۔ وہ تو ملکہ بن کر بھول ہی گئی تھی کہ کبھی وہ کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ بچیوں کو ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کہاں ٹلنے والی تھیں۔ ادھر دنیازاد نے بہن کو ٹوکا: "اے بہن' مجھے بولنے کا حق تو نہیں' دادی پوتیوں کی بیچ میں میں بولنے والی کون' مگر انصاف کی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے۔ آخر یہ تمہاری پوتیاں ہیں' گھر میں دادی بیٹھی ہے جو کہانیاں سنانے میں طاق ہے۔ پوتیاں آخر دادی کے فیض سے کیوں محروم رہیں اور گھر چھوڑ کر کس دروازے کو کہانیوں کیلئے کھٹکھٹائیں۔"

شہر زاد بہن کی بات سن کر پسیجی۔ پوتیوں سے بولی: "اے چندا' میں تمہارے

قربان جاؤں، تمھیں کہانی نہیں سناؤں گی تو کسے سناؤں گی مگر ابھی تو دن ہے۔ کہانی دن میں سنائی جائے تو مسافر رستہ بھول جاتا ہے۔ رات ہو جانے دو۔ پھر میں تمھیں کہانی سناؤں گی۔"

کہانی سننے کی آس میں رات کا کس شدت سے انتظار کیا گیا۔ رات آئی اور تینوں پوتیاں شہر زاد کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ دنیا زاد بھی قریب آن بیٹھی۔ کتنے زمانے بعد اسے ایک مرتبہ پھر شہر زاد سے کہانی سننے کا موقع مل رہا تھا۔

مگر عجب ہوا۔ شہر زاد نے بہت سوچا' بہت یاد کیا' اسے کوئی کہانی یاد ہی نہیں آئی۔ پریشان ہو کر دنیا زاد سے بولی: "اے دنیا زاد' میرے تو حافظہ پہ پتھر پڑ گئے ہیں' کیا سناؤں مجھے تو کوئی کہانی یاد ہی نہیں آ رہی۔"

"لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔" دنیا زاد بولی "تم نے اپنے سرتاج کو اتنی کہانیاں سنائی تھیں انہیں میں سے کوئی کہانی ان بچیوں کو سنادو۔"

"مگر کون سی سناؤں۔ مجھے تو کوئی کہانی یاد نہیں آ رہی۔"

"اے بہن' وہ جو تم نے پہلی رات کو سنائی تھی سوداگر اور دیو کی کہانی وہی سنادو۔"

سوداگر اور دیو کی کہانی...... شہر زاد بڑبڑائی۔

یاد کرنے لگی کہ وہ کیا کہانی تھی۔ کچھ یاد نہ آیا تو پریشان ہو کر کہا "اے دنیا زاد' سوداگر اور دیو کی کہانی میں کیا ہوا تھا مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"اے لو اپنی کہی ہوئی کہانی بھول گئیں۔ اس میں یہی تو ہے کہ سوداگر نے چھوارا کھا کر گٹھلی پھینکی۔ گٹھلی کا پھینکنا تھا کہ دھواں اٹھا۔ دھوئیں میں سے ایک دیو برآمد ہوا۔ گرجنے لگا کہ تیرے چھوارے کی گٹھلی میرے بیٹے کے سینے میں جا کر لگی۔ وہ مر گیا۔ اب میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ مرنے کے لیے تیار ہو جا۔"

شہر زاد نے غور سے سنا۔ پھر یاد کرنے کی کوشش کی کہ آگے کیا ہوا تھا۔ جب

کچھ یاد نہ آیا تو دنیازاد سے بولی کہ "میری بہن دنیازاد، مجھے تو اب کچھ بھی یاد نہیں ہے مگر لگتا ہے کہ تجھے یہ کہانی پوری یاد ہے۔ پھر تو ہی کیوں نہیں سنا دیتی۔"

دنیازاد نے سوچا اور بولی کہ "بلبل ہزار داستان تو تم ہو۔ بیان میں تم جو جادو جگاتی تھیں وہ تو میں نہیں جگا سکتی۔ جیسی تم سے سنی اسے اپنے ٹوٹے پھوٹے انداز میں سنائے دیتی ہوں مگر اس شرط پر کہ کل اس سے آگے کی کہانی تم سناؤ گی۔"

شہرزاد نے یہ شرط مان لی۔ اور دنیازاد نے بچیوں کو خوب مزے لے لے کر سوداگر اور دیو کی کہانی سنائی۔ کہانی سن کر تینوں کھل اٹھیں۔ دنیازاد نے کہا کہ "بچیو، میری زبان میں شہرزاد والا جادو کہاں۔ جب تم کل رات اپنی دادی سے کہانی سنو گی تب دیکھنا تمہیں کتنا لطف آئے گا۔"

دنیازاد سے کہانی سن کر شہرزاد کے حافظہ میں ہلچل مچ گئی۔ ساری کہی ہوئی کہانیاں اس کے دل و دماغ میں منڈلانے لگیں لیکن ٹکڑوں، نوالوں کی صورت میں۔ خیر کوئی بات نہیں، شہرزاد نے اطمینان کی ایک کیفیت کے ساتھ سوچا، میرا حافظہ جاگ اٹھا ہے۔ کل جب کہانی کہنے بیٹھوں گی تو انشاءاللہ سب کچھ یاد آجائے گا۔ سو دوسری رات وہ بہت اعتماد کے ساتھ اپنی پوتیوں کو لے کر بیٹھی۔ دنیازاد بھی اس کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی مگر شہرزاد کو بس اتنا یاد آیا کہ اگلی کہانی جو اس نے سنائی تھی وہ ماہی گیر اور دیو کی کہانی تھی۔ اس سے آگے اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ دنیازاد نے لقمہ دیا کہ "اے بہن، ہوا یوں تھا کہ ماہی گیر نے دریا میں جال ڈالا۔ جال بھاری ہوا تو اس نے سمجھا کہ کوئی موٹی مچھلی پکڑی گئی، مگر جب جال کھینچا تو اس میں تو ایک پیتل کی سربمہر لٹیا پھنسی ہوئی تھی۔ مہر حضرت سلیمان کی تھی۔ مہر کو توڑ کر لٹیا کا منہ کھولا تو اس میں سے ایسا کالا دھواں نکلا کہ اندھیرا چھا گیا اور اس دھوئیں کے بیچ سے ایک لحیم شحیم دیو دڑو نکتا نکلا۔"

شہرزاد حیرت سے بولی: "دنیازاد لگتا ہے کہ یہ کہانی بھی تجھے ہی پوری یاد

ہے۔ پھر تو ہی سنا دے۔ مجھے تو کہانی کی کوئی بات یاد ہی نہیں آ رہی۔"

دنیازاد تو اب ماشاءاللہ چل نکلی تھی۔ اس نے ماہی گیر اور دیو کی کہانی شہرزاد والی شان سے شروع کی اور صبح ہوتے ہوتے پوری کہانی سنا دی اور شہرزاد نے کہانی ایسے سنی جیسے وہ بے ہی دنیازاد کی کہی ہوئی کہانی۔ وہ تو بس سننے والیوں میں ہے۔ تینوں نواسیوں کا جی بھی کہانی سن کر باغ باغ ہو گیا۔

اگلی رات شہرزاد کو یقین تھا کہ اسے اگلی کہانی یاد آ جائے گی۔ جب وہ کہانی یاد نہ آئی تو اس نے دوسری کہانیوں کی طرف ذہن دوڑایا۔ الٰہ دین کے چراغ والی کہانی اسے جہاں تہاں سے یاد آتی مگر کڑی سے کڑی نہیں مل رہی تھی۔ پھر دنیازاد ہی کو وہ سنانی پڑی۔

بس پھر تو شہرزاد کو مساواتی پڑ گئی۔ وہ کہانی یاد کرنے کی کوشش کرتی۔ اسے تو کہانی یاد نہ آتی۔ اس کی فرمائش پر دنیازاد کہانی سنانی شروع کر دیتی۔ بس اسی طرح دنیازاد نے ساری الف لیلہ سناڈالی۔

شہرزاد نے ڈوب کر یہ کہانیاں سنیں۔ یہ سب کہانیاں میں نے سنائی تھیں' اسے کتنی حیرت ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ حیرت کی جگہ اداسی نے لے لی۔ اسے ایک ایک کر کے وہ ساری راتیں یاد آئیں۔ ایک ہزار ایک راتیں جب اس نے یہ کہانیاں سنائی تھیں۔ ہر رات یوں لگتا کہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے مگر اب ان میں سے ہر رات یوں دکھائی دے رہی تھی کہ وہی اس کی زندگی کا حاصل تھی۔ وہ راتیں ایک سحر بن کر اس پر چھاتی چلی گئیں۔ اصل میں تو میں نے انہیں راتوں میں زندگی کو پایا تھا' اس نے اداس ہو کر سوچا اور ایک دفعہ پھر وہ سوئی ہوئی راتیں جاگ اٹھیں اور اس کے ارد گرد منڈلانے لگیں۔ رات بھیگتی جاتی اور وہ اپنے کرداروں کے ساتھ اجنبی جزیروں' سمندروں' صحراؤں میں بھٹکتی پھرتی۔ اتنی دور نکل جاتی کہ موت اور زندگی کے سارے اندیشے اور

وسوسے کہیں بہت پیچھے رہ جاتے۔ پھر جب پو پھٹتی اور مرغ سحر کی بانگ سنائی دیتی تو وہ کس اعتماد سے کہانی کو اگلی رات پر موقوف کرتی کہ موت سہم کر پیچھے ہٹ جاتی۔

شہر زاد کتنی دیر تک ان کہانیوں سے لبریز راتوں کے سحر میں کھوئی رہی۔ اس سحر سے نکلی تو اب کی راتوں کا خیال آیا اور اب' اس نے سوچا۔ اب میری راتیں ویران ہیں۔ صرف کالی اور لمبی ہیں۔ ان کا جادو رخصت ہو چکا ہے۔ میری راتیں جو بانجھ ہو چکی ہیں' اس نے لمبا ٹھنڈا سانس بھرا اور گہری اداسی میں ڈوب گئی۔

جب بادشاہ محل میں آیا تو دیکھا کہ شہر زاد خلاف معمول چپ چپ ہے۔ صورت سے اداسی ٹپکتی ہے۔ خیر اس دن تو وہ چپ رہا مگر جب دیکھا کہ شہر زاد کی طبیعت بحال ہونے ہی میں نہیں آ رہی اور اداسی گہری ہوتی چلی جا رہی ہے تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ آخر رہا نہ گیا اور ایک روز پوچھ ہی لیا کہ "اے شہر زاد میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ نہ وہ پہلی سی شوخی نہ طراری۔ نہ ہنسنا نہ بولنا' طبیعت افسردہ۔ چہرے کی رنگت پھیکی پھیکی۔ یہ کیسا حال ہے۔ کونسا غم ہے کہ تجھے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔"

اس پر شہر زاد نے ضبط کا دامن چھوڑا۔ روئی اور بولی: "اے مرے سر تاج' تو کس شہر زاد کا حال پوچھتا ہے جو شہر زاد چہکتی بولتی کہانیاں سناتی تیرے محل میں آئی تھی وہ تو کب کی مر چکی۔"

بادشاہ یہ سن کر سٹپٹایا۔ پریشان ہو کر بولا: "یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ اگر طبیعت پہ کوئی ملال ہے تو اس کی وجہ تو معلوم ہونی چاہیے۔"

"اے بادشاہ' اے مرے سر تاج" شہر زاد غم زدہ آواز میں بولی۔ "تو نے میری جان تو بخش دی مگر مجھ سے میری کہانیاں چھین لیں۔ مگر میں تو انہیں کہانیوں میں زندہ تھی۔ وہ کہانیاں ختم ہوئیں تو سمجھو کہ میری کہانی بھی ختم ہو گئی۔"

ریزرو سیٹ

"ارے میری تو عقل حیران ہے۔ جب خواب دیکھوں مُردے ہی مُردے۔ جانے کن کن قبروں سے نکل کے آجاوے ہیں۔ اب یہی دیکھو' رات میں کتنا سوئی ہوں گی۔ رات گئے تک کروٹیں بدلتی رہی۔ آنکھ ہی نہیں لگی۔ فجر کی اذان ہوئی ہے تب کہیں جا کے آنکھ لگی ہے۔ اے لو کیا دیکھوں ہوں کہ احمدی بوا۔ ارے میں تو انہیں بھول ہی گئی تھی۔ لوگ منوں مٹی تلے جا سوئے۔ کس کس کو آدمی یاد رکھے۔ میں حیران کہ احمدی بوا کہاں سے آگئیں اور جیسے پھر سے جوان ہو گئی ہوں۔ کیسے ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ پاندان سامنے کھلا رکھا تھا۔ ہاتھ میں سروطہ۔ کٹر کٹر چھالیں کتر رہی تھیں۔ میں پوچھنے لگی کہ اے احمدی بوا...... اے لو زبان کھولی ہی تھی کہ ایک بی بی آن دھمکی۔ میں تو اسے پہچانی نہیں۔ پھر بیبیاں ہی بیبیاں۔ سر سے پاؤں تک سفید۔ بس پٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔"

بڑی بو چپ ہو گئیں۔ پھر بڑبڑانے لگیں "اللہ ہی جانے مجھے اتنے مُردے کیوں دکھائی دیوے ہیں۔ ویسے تو مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میرا کیا لے جاتے ہیں۔ کچھ دے کے ہی جاویں ہیں۔ پچھلی جمعرات ہی کی تو بات ہے۔ کیا دیکھوں ہوں کہ جیسے ممن

پھوپا آئے ہیں۔ مجھے کچھ دے رہے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ ممن پھوپھا اتنا میں کیا کروں گی۔ کہہ رہے ہیں کہ بچے کھائیں گے۔ اے لو میری آنکھ کھل گئی۔"

یہ ایک دن کی بات تھوڑا ہی تھی۔ بڑی بو روز ہی کوئی نہ کوئی خواب سنا دیتیں۔ تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنے خواب دیکھتی ہیں اور جو خواب دیکھتیں اس میں انہیں مردے ہی نظر آتے۔ اس پہ وہ خود بھی حیران تھیں کہ مردے ان سے کیوں اتنے مانوس ہیں۔ دور نزدیک کے کتنے پرکھے ان کے خوابوں میں آئے اور جو آیا کچھ نہ کچھ دے کر گیا۔ ہمیں تو ان کے خوابوں ہی سے پتہ چلا کہ ہمارے کون کون بزرگ تھے۔ کب کب دنیا سے گئے اور کہاں کہاں دفن ہیں۔ ایسے بھی تھے جو کالے کوسوں جا کر اللہ کو پیارے ہوئے مگر بڑی بو جانے خواب میں کیا پھونکتی تھیں کہ کالے کوسوں سونے والے بھی کسی نہ کسی گھڑی ان کے خواب میں ضرور آتے تھے۔ "ارے کیا دیکھوں ہوں کہ جیسے میرے خل سسرے آئے ہیں۔ ارے وہ تو فرنگی کی اردل میں رنگون چلے گئے تھے۔ ہم نے تو اپنی خل سس کو سدا اکیلا ہی دیکھا۔ بس مہینے کے مہینے منی آرڈر آجاوے تھا۔ وہیں اللہ کو پیارے ہوئے۔ میں حیران کہ یہ تو رنگون میں تھے۔ یہاں کیسے آگئے۔ کہنے لگے بہو اچھے ہو۔ لو دیکھو میں تمہارے لیے رنگون سے کیا لایا ہوں۔ پوٹلی سے کچھ نکالنے لگے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی۔"

اکثر یہی ہوتا تھا کہ عین اس گھڑی جب انہیں کچھ ملنے لگتا تھا ان کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ پھر بھی انہیں مُردوں سے اتنا کچھ مل چکا تھا کہ جاگتی آنکھوں اگر زندوں سے اس کا عشر عشیر بھی مل جاتا تو وہ نہال ہو جاتیں۔ مگر وہ اسی میں نہال تھیں کہ جو بھی روح ان کے خواب میں آتی ہے انہیں کچھ دے کر جاتی ہے۔ ہر خواب کے بعد وہ کتنی خوش نظر آتی تھیں۔ ہاں ایک خواب پر تھوڑی فکر مند ہوئی تھیں "ارے رات تو میں نے ایسا پریشان خواب دیکھا کہ میں دہل گئی۔ جیسے کوئی گھر ہے۔ یہ گھر تو نہیں تھا۔ پتہ

نہیں کون سا گھر تھا۔ عجیب ہی طرح کا تھا۔ یہ بڑا کمرہ جیسے چوپال ہو۔ بیچ میں چارپائی پہ کوئی چادر تانے سو رہا تھا۔ میں کہوں یااللہ یہ کون سو رہا ہے۔ اگلے کمرے میں گئی تو کیا دیکھوں ہوں کہ سامنے سے ننھی بوا آ رہی ہیں۔ اصغری چل میرے ساتھ۔ میں تجھے لینے آئی ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑا ایسی تیزی سے چلیں کہ کیا بتاؤں۔ آگے جیسے اندھیری گلی۔ میری تو جان نکل گئی۔ میں نے زبردستی ہاتھ چھڑایا۔ چھوڑو مجھے۔ میں نہیں جاتی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ہاتھ چھڑا کے میں بھاگی آگے گھپ اندھیرا۔ اے لو میری آنکھ کھل گئی۔"

بڑی بو گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ فکر مند لہجہ میں بولیں "اللہ ہی جانے کیسا خواب تھا۔ میں نے بس فوراً ہی اسے امام زماں کے سپرد کر دیا۔ پریشان خواب کو تو میں فوراً ہی امام زماں کے سپرد کر دوں ہوں۔" رکیں' پھر سوچتے ہوئے بولیں "اب کوئی تعبیر بتانے والا بھی تو نہیں ہے۔ بڑے ابا' اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے' ایسی تعبیر بتاتے تھے کہ ایک ایک بات ٹھیک نکلتی تھی۔ لوکب کا خواب یاد آیا۔ جیسے میری گود میں کسی نے کیلا ڈال دیا یہ لمبا کیلا ہری چھال کا۔ میں حیران ہو کے کہہ رہی ہوں کہ یہ کیلا مجھے کون دے گیا ہے۔ میں نے اگلے دن بڑے ابا کو یہ خواب سنایا۔ بولے کہ بس اب اس خواب کا کسی سے ذکر مت کرنا۔ اللہ نے چاہا تو تیرے گھر بیٹا ہوگا۔ ان روزوں میں دنوں سے تھی۔ اٹھواں مہینہ لگا تھا۔ اے لو اگلے مہینے مرتضیٰ پیدا ہو گیا۔"

بڑی بو کو اگلے پچھلے خواب بھی تو بہت یاد تھے۔ جس روز نیا خواب سنانے کے لیے نہیں ہوتا تھا اس روز پرانے خوابوں کا بستہ کھولتیں اور کئی کئی خواب سنا ڈالتیں۔ مگر وہ دوسروں کے خواب ہوتے تھے۔ کوئی بڑے ابا کا' کوئی پھوپھی اماں کا' کوئی منجھلی خالہ کا۔ "ارے ہندو مسلمان کی مار کاٹ تو بہت بعد میں ہوئی ہے۔ بڑے ابا نے تو

خواب میں پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس وقت تو کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ کمبخت ایسی بیرا کھیری ہو گی کہ گھر اجڑ جاویں گے بڑے ابا اس روز بہت پریشان تھے۔ کہنے لگے کہ عجب خواب تھا۔ جیسے صحن کے عین بیچ میں ایک لمبا سا کانٹا پڑا ہے۔ میں تشویش سے کہہ رہا ہوں کہ یہ سیہہ کا کانٹا یہاں کون پھینک گیا ہے۔ چپ ہوئے پھر بولے نامبارک خواب ہے۔ اللہ ہم سب پہ رحم کرے۔"

تو کبھی اپنے خواب، کبھی بزرگوں کے خواب سنائے اور فارغ ہوئیں۔ آج ایک خواب بیان کر رہی ہیں۔ اگلے دن اگلا خواب۔ مگر ایک خواب پر آ کر اٹک گئیں۔ "جیسے کوئی سٹیشن ہے۔ قلی دوڑتے پھر رہے ہیں اور چلاّ رہے ہیں۔ گاڑی ارئی ہے گاڑی ارئی ہے۔ مسافروں میں کھلبلی پڑی ہوئی ہے۔ کسی نے بستر سر پر اٹھا رکھا ہے۔ کوئی قلی کے سر پہ ٹرنک رکھوا رہا ہے۔ اے لو چھک چھک کرتی ریل آ گئی۔ مسافر اس پہ ٹوٹ پڑے۔ مت پوچھو کتنی مشکلوں سے دھکے کھاتی گرتی پڑتی ڈبے میں گھسی ہوں۔ کیا دیکھوں ہوں کہ سامنے ہی کھڑکی کے برابر سیّدانی بی بیٹھی ہیں۔ میں حیران کہ سیدانی بی کی تو اب قبر میں ہڈیاں بھی سلامت نہیں ہوں گی۔ یہ یہاں پہ کیسے آ گئیں۔ پھر کیا دیکھوں ہوں کہ ان کے ساتھ سٹی ہوئی وہ سارے زمانے کی حرافہ بلو بیٹھی ہے۔ کیسے بڑے بڑے دیدوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آوارہ کہیں کی۔ جس گھر میں قدم رکھا اس گھر میں میاں بیوی میں جو تم بیزار کرا دی۔ جیتی رہتی تو پتہ نہیں کتنی طلاقیں دلواتی۔ سیّدانی بی نے مجھے اشارہ کیا۔ میں ان کے برابر والی سیٹ پہ بیٹھنے لگی تھی کہ بخت مارا بابو آن دھمکا۔ کہا کہ ٹکٹ دکھاؤ۔ میں نے کہا کہ لے دیکھ لے۔ ٹکٹ دیکھ کے کہنے لگا کہ اماں 'یاں تو تمہاری کوئی سیٹ ریزرو نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اے بیٹا' نہیں ہے تو کر دے۔ برابر میں یہ جگہ خالی پڑی ہے۔ اسی پہ بیٹھ جاؤں گی۔ بولا' یہ سیٹ تو دوسرے کے نام پہ ریزرو ہے۔ ارے بیٹا تو کیا میں کھڑے کھڑے سفر کروں گی۔ بولا'

اماں جی' اس گاڑی میں اب کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ تم اتر جاؤ۔ اے ہے میں اتر کے کہاں جاؤں۔ اماں پیچھے گاڑی آرہی ہے۔ اس میں بہت جگہ ہے اس میں بیٹھ جانا۔ میں نے لاکھ منتیں کیں' دہائیاں دیں۔ اس کمبخت نے ایک نہ سنی۔ مجھے گاڑی سے اتار دیا۔ میرے سامنے سے وہ گاڑی چھک چھک کرتی چلی گئی۔ اٹااٹ بھری ہوئی۔ میں نے جو نظر ڈالی تو سب مُردے۔ میں حیران۔ پھر زور کی سیٹی بجی کہ میرے کان پھٹ گئے اور ریل تو جیسے چھو ہو گئی۔"

بڑی بو چپ ہو گئیں۔ پھر بڑبڑائیں "اللہ جانے اس خواب کا مطلب کیا ہے" پھر چپ ہو گئیں اور جیسے گہری سوچ میں ڈوب گئی ہوں پھر بولیں جیسے انہوں نے خواب کا مطلب پالیا ہو "میں تو جانوں یہ غیب سے اشارہ ہوا ہے کہ اصغری تیرا وقت آگیا۔ اب تو تیار ہو جا۔ اے ہے مجھے کیا تیار ہونا ہے۔ میں تو پہلے سے تیار بیٹھی ہوں۔"

پھر جیسے اس خواب نے بڑی بو کو گھیر لیا ہو۔ روز ہی کسی نہ کسی بہانے انہیں یہ خواب یاد آجاتا۔ "میں جانوں میرا وقت آگیا ہے۔ بس کسی روز بلاوا آجاوے گا۔ بلانے والے کی طرف سے اشارہ تو ہو گیا ہے بلاوا اب آیا کہ جب آیا۔ ارے آبھی چکے۔ میں تو خود تیار بیٹھی ہوں۔"

"نہیں بڑی بو' ابھی آپ نہیں جارہیں۔ ابھی آپ کو بہت جینا ہے۔"

"اے ہے میں اتنا تو جی لی۔ اب کیا مجھے قیامت کی بورئیں گھسیٹنی ہیں" پھر ان پر رقت طاری ہو گئی "ابا میاں چلے گئے۔ اماں سدھار گئیں۔ بڑے بھیا بھی مٹی تلے جا سوئے۔ سب ہی چلے گئے۔ میں بے حیا اکیلی انہیں رونے کے لیے رہ گئی۔ نہیں اب میں نہیں رکوں گی۔ بلانے والے مجھے شوق سے بلالے۔"

اس کے بعد سے بڑی بو نے کتنی شدت سے دوسرے خواب کا انتظار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ بس آج کل میں انہیں خواب دکھائی دے گا اور وہ ریل گاڑی جس کی ریل

بابو نے خبر دی تھی چھک چھک کرتی آئے گی۔ بڑبڑانے لگتیں "پتہ نہیں کیوں دیر ہو رہی ہے۔ ارے میں تو سامان باندھے بیٹھی ہوں۔ گاڑی آئی اور میں گئی۔" مگر عجب ہوا کہ کہاں روز انہیں کوئی نہ کوئی خواب دکھائی دے جاتا تھا اور کہاں اب انہیں سرے سے کوئی خواب ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس سے ان کی بے چینی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ کبھی کبھی ان پہ پچھتاوا طاری ہو جاتا "ارے مجھ ہی سے چوک ہو گئی۔ میں زبردستی وہیں سیدانی بی سے سنٹ کے بیٹھ جاتی۔ وہ میرا کیا کر لیتا۔ کیا مجھے ڈنڈاڈولی کر کے اٹھاتا یا دھکے دے کے باہر دھکیلتا اور سیدانی بی کی بے مروتی دیکھو۔ وہ مڑ مڑ دیکھتی رہیں۔ کچھ بولی ہی نہیں۔ ارے وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتیں تو مجھے بھی سہارا مل جاتا۔ پھر موئے بابو کو میں ایسی دھتا بتاتی کہ یاد کرتا۔ ارے کسی کو کیا کہوں میری ہی مت ماری گئی تھی۔"

"بڑی بو' اچھا ہی ہوا۔ ایک بزرگ کا سایہ سروں پہ ہے۔ وہ بھی اٹھ جاتا تو کیا ہوتا۔"

"ارے نیک بختو' تم جگ جگ جیو' زندگی کی بہاریں دیکھو' بزرگوں کو تو جانا ہوتا ہی ہے۔ بڈھے ٹھڈے کتنے دن ٹک سکتے ہیں۔ میں بڑھیا بھی آخر کب تک جیوں گی۔ جانا تو اب ٹھہر ہی گیا ہے۔ گاڑی آئی اور میں گئی۔"

گاڑی بڑی بو کے تصور میں ایسی بسی تھی کہ اٹھتے بیٹھتے اس کا ہی ذکر کرتی تھیں۔ اسی میں وہ بیمار پڑ گئیں۔ بیمار تو وہ پہلے بھی کئی دفعہ ہوئی تھیں لیکن اب کے یہ لگتا تھا کہ خود اپنی نیت سے مرنے کے پختہ ارادے کے ساتھ بیمار پڑی ہیں۔ بیمار پڑتے ہی انہوں نے اعلان کیا کہ اب میں نہیں جیوں گی۔ دوادارو پہ خاک ڈالو۔ مرتضیٰ کو بلاؤ۔ اس کی صورت دیکھے بغیر کیسے چلی جاؤں۔ اور پھر آخر اسے مجھے قبر میں بھی اتارنا ہے۔

یہ تو ہمیں معلوم ہی تھا کہ بڑی بو' مرنے پہ تلی بیٹھی ہیں۔ سدھارنے کے لیے انہیں کوئی بہانہ چاہیے اور اب بہانہ انہیں مل گیا تھا۔ سو اب ہمیں بھی یہ گمان

ہونے لگا کہ بڑی بو کا آخری وقت آگیا ہے۔ واقعی مرتضیٰ ماموں کو اطلاع دے دینی چاہیے۔ سو بڑی بو نے جس مایوسانہ لہجہ میں اپنے آخری وقت کا ذکر کیا ان سے آکر صورت دکھا جانے کی منت کی اسی لہجہ میں انہیں کے لفظوں میں ان کی طرف سے مرتضیٰ ماموں کو ہم نے خط لکھ دیا کہ میرے لال میری آنکھ بند ہونے لگی ہے مگر حسرت یہ ہے کہ بیٹے پوتے کو ایک نظر دیکھ کر دنیا سے جاؤں۔ سو میرے لال دروازے پہ میری آنکھیں لگی ہیں۔ جب تک نہیں آؤ گے تن سے جان بیشک نکل جاوے آنکھ بند نہیں ہوگی۔

اس کے بعد بڑی بو' کی آنکھیں واقعی دروازے پر لگ گئیں۔ جس گاڑی کی آمد کا انہیں انتظار تھا وہ کہیں پس منظر میں چلی گئی۔ اب وہ بے چینی سے بیٹے کی راہ تک رہی تھیں۔ ایک انتظار کی جگہ دوسرے انتظار نے لے لی اور کس بے چینی سے انہوں نے مرتضیٰ ماموں کا انتظار کیا۔ "پتہ نہیں کب آوے گا۔ ارے میں نے اسی گھڑی کے لیے تو اس سے کہا تھا کہ بیٹا کالے کوسوں سے کیسے آؤ گے۔ ادھر تبادلہ کرالو۔ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جانے کس گھڑی بلاوا آجاوے۔ وقت پہ تم کیسے پہنچو گے۔"

خیر مرتضیٰ ماموں بڑی بو کے حساب سے کتنی ہی دیر سے پہنچے ہوں پھر بھی وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ بلکہ بہت دیر پہلے۔ بڑی بو کو تو بیٹے اور پوتے کو دیکھ کر نئی زندگی مل گئی۔ ایسے اٹھ کر بیٹھ گئیں جیسے کبھی بیمار ہی نہیں پڑی تھیں۔

مرتضیٰ ماموں ارتضیٰ کو بھی ساتھ لائے تھے۔ اب وہ ماشاءاللہ کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ یہاں تھا تو گلیوں میں خاک اڑاتا پھرتا تھا اس وقت اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ایک اسے غلیل کا چسکا لگ گیا تھا۔ بڑی بو' اسے روکتی ٹوکتی رہتی تھیں کہ ارے بیٹا' کیوں پرندوں کے پیچھے پڑا ہے۔ خدا بری گھڑی سے بچائے۔ پرندے بھی سب طرح کے ہوتے

ہیں۔ انہیں چھیڑنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مگر ارتضٰی کہاں سنتا تھا۔ آنکھیں اور کان دونوں غلیل کے تابع تھے مگر اب وہ بڑا ہو گیا تھا اور ماشاء اللہ کیا قد نکالا تھا اور طبیعت میں کتنی سنجیدگی آ گئی تھی۔ اب اس کی ساری توجہ اپنی تعلیم پر تھی۔ بی اے پاس کر کے اب ایم اے میں قدم رکھا تھا۔ بڑی بو نے اس کی جی بھر کے بلائیں لیں۔ بیٹے سے کہا "مرتضٰی بیٹے 'ارتضٰی کی عمر 'شیطان کے کان بہرے 'اب شادی کی عمر ہو گئی ہے۔ اس کے لیے لڑکی تلاش کرو۔"

"شادی" مرتضٰی ماموں نے بے فکری سے کہا "اسے اپنی تعلیم تو پوری کر لینے دو۔"

"تختہ لوٹی تعلیم تو شیطان کی آنت ہو گئی۔ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔ یہ نہ ہو کہ تعلیم پوری ہوتے ہوتے سب اچھی لڑکیں نکل جاویں۔ پھر کیا کرو گے؟"

"ہمیں کیا کرنا ہے جو کرے گا اللہ کرے گا۔"

"اللہ تو کرے گا مگر بندے کو بھی اپنی طرف سے سوچنا سمجھنا چاہیے۔ اور بیٹے کچھ میرا بھی تو خیال کرو۔ میری حسرت ہے کہ پوتے کا سہرا دیکھ کے دنیا سے جاؤں۔"

یہ بات سن کر ہم دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے کہ بڑی بو نے کسی کے بغیر کہے سنے خود ہی اپنی زندگی کی میعاد میں مناسب اضافہ کر لیا ہے۔

بی اے 'ایم اے کیا ہوتے ہیں۔ یہ تو بڑی بو کو پتہ نہیں تھا۔ وہ تو یہ دیکھ کر خوش ہوئی تھیں کہ باپ نے بیٹے کی مذہبی تعلیم پر توجہ دی ہے۔ انہیں یہ دیکھ کر کتنا اطمینان ہوا کہ ارتضٰی مسئلے مسائل سے بھی واقف ہے اور نماز بھی پابندی سے پڑھتا ہے۔ شاید یہاں آ کر اس نے زیادہ ہی پابندی سے پڑھنی شروع کر دی تھی۔ صبح کی نماز وہ باقاعدہ مسجد میں جا کر پڑھتا تھا۔ اس روز بھی وہ اپنے دستور کے مطابق صبح کی اذان سے پہلے اٹھا اور مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ یہاں سے باپ بیٹے کی روانگی کا دن تھا۔ مرتضٰی

ماموں کی چھٹی اب ختم ہو رہی تھی اور بڑی بو بھی اللہ کے فضل سے صحت یاب ہو چکی
تھیں۔ بلکہ انہوں نے تو اب دوا کھانی بھی چھوڑ دی تھی کہنے لگیں "کمبخت یہ کڑوی
کسیلی ڈاکٹری دوائیں میرے حلق سے نہیں اترتیں۔ بس اب میں اچھی ہوں۔ ہو گئے
بہت چوچلے۔ کب تک پالنے میں جھولوں گی۔" اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
اور چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ پھر پہلے کی طرح چہکنے مہکنے لگیں اور اب تو کتنے دنوں سے
انہیں کوئی خواب بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ پچھلے خواب بھی اب کہاں یاد آتے تھے۔
مردے بھی تو خوابوں ہی کے جلو میں آتے تھے۔ سو وہ بھی اب فراموش ہو گئے۔ سمجھو
کہ مردے ان کی خیالی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اب ایک نئی زندگی انہیں للچا رہی تھی
اور پوتے کے سہرے کا تصور ان کے یہاں بندھا ہوا تھا۔ بلکہ انہوں نے لڑکی ڈھونڈنی
بھی شروع کر دی تھی۔ خاندان کی اور خاندان سے باہر کی کتنی لڑکیوں کو انہوں نے گن
ڈالا۔ پھر ایک ایک لڑکی کی صورت اور سیرت کا جائزہ لیا۔ کہتی تھیں کہ اپنے ارتضٰی کے
لیے ایسی دلہن لاؤں گی کہ چراغ لے کے ڈھونڈو گے تو اس کا ثانی نہیں ملے گا۔

بس اسی میں رخصتی کا دن آ گیا۔ اس صبح ارتضٰی اذان سے پہلے اٹھ گیا۔ لپک
جھپک مسجد کی طرف دوڑا۔ بڑی بو بھی تڑکے ہی اٹھ بیٹھیں۔ صبح کی نماز اب پھر انہوں
نے وقت پر پڑھنی شروع کر دی تھی۔

بڑی بوا بھی جانماز ہی پہ تھیں کہ محلّہ میں شور پڑ گیا۔ انہوں نے کلیجہ پہ ہاتھ
رکھا "الٰہی خیر، یہ کیسا شور ہے۔" مگر خیر کہاں تھی۔ مسجد میں ابھی صف کھڑی ہوئی تھی
کہ کچھ مسٹنڈے منہ پر ڈھاٹے باندھے کلاشنکوفیں تانے اندر گھس آئے اور نمازیوں کو
بھون ڈالا۔ کتنے تو سجدوں سے سر ہی نہیں اٹھا سکے۔

مار پیچھے پکار پڑی۔ خلقت مسجد کی طرف دوڑ پڑی۔ محلّہ والے ارتضٰی کو اٹھا کر
گھر لائے۔ خون میں لت پت۔ فوراً ڈاکٹر کے لیے آدمی دوڑائے گئے۔ مگر ادھر وقت

آچکا تھا۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

بڑی بو نے سینے پہ دوہتڑ مار مار کے اپنا آپا دھن ڈالا۔ اپنے آپ کو کوسا کہ کیوں انہوں نے ارتضیٰ کو ساتھ لانے کے لیے لکھا تھا۔ پھر دہشت گردوں کو کوسنے لگیں کہ ان کلموؤں کو ڈھائی گھڑی کی موت آئے۔ کیسے شقی تھے کہ خانۂ خدا کا بھی پاس نہ کیا۔ ارے کم بختو، تم کیسے مسلمان تھے۔ بچے کو نماز ختم کر لینے دیتے اور پھر بلک بلک کے بین کرنے شروع کر دیئے۔

روتے روتے اچانک انہیں اپنا گاڑی والا خواب یاد آیا اور وہ دم بخود رہ گئیں "ہائے اللہ، اس وقت تو میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ریل بابو کہہ کیا رہا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ ماں جی یہ سیٹ تمہاری نہیں ہے، دوسرے کے نام پہ ریزرو ہے۔ اسی گھڑی کوئی آیا اور اسی جگہ پر آ کے بیٹھ گیا۔ کوئی لڑکا سا تھا۔ مگر میں اپنی مصیبت میں تھی۔ میں نے دھیان ہی نہیں دیا کہ کون ہے۔ ہائے مجھ کال کھاتی کو کیا خبر تھی۔ دیکھتی تو سہی کہ جو آ کے بیٹھا ہے وہ ہے کون۔" اور بڑی بو نے سینہ پیٹ پیٹ کے پھر رونا شروع کر دیا۔
"ہائے میں رہ گئی۔ وہ چلا گیا۔"

وارد ہونا شہزادہ تورج کا شہر کاغذاباد میں اور عاشق ہونا ملکہ قرطاس جادو پر

شہزادہ تورج نے اس بستی میں قدم رکھا تھا کہ ایک نئی حیرت سے دوچار ہوا۔ حیرتوں کے مرحلے تو اس سے پہلے بھی آئے تھے۔ ابھی جس شہر طلسم کو فتح کر کے آرہا تھا اس نے کیا کم حیران کیا تھا۔ اس دیار میں قدم رکھتے ہی ایسی آندھی چلی تھی کہ خدا کی پناہ۔ اور قریب و دور سے وحشت ناک آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ پکڑو پکڑو۔ ابھی یہ شور مچتا تھا کہ ایک ساحر نمودار ہوا۔ کالا بھجنگ' ڈھوہ کا ڈھوہ۔ اسے دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ ساتھ ہی میں تلوار کا وار کیا۔ اس نے وار خالی دیا اور پھر ایسا وار کیا کہ تلوار سر سے اتر کر کمر تک گئی۔ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سیاہی چھا گئی۔ چیخ وحشت بھری بلند ہوئی۔ میں آہن جادو مارا گیا۔ جان ہار گیا۔ چیخ کی گونج دور دور تک گئی۔ فوراً ہی ایک اور ساحر نمودار ہوا۔ کاندھے پہ گرز رکھے ہوئے کہ گرز نریمان سے بڑھ کر بھاری تھا۔ چلّایا کہ میں گرداب جادو' ملکہ حیرت کا خالو' کیوں جان گنواتا ہے۔ ابھی وقت ہے واپس چلا جا' ورنہ یہ گرز' اور ابھی اس نے گرز اٹھایا تھا کہ تورج نے بڑھ کر اس کے بازو کو جھٹکا دیا کہ گرز گر پڑا۔

فوراً ہی اس پر پل پڑا۔ کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ایک ہاتھ سے اس طرح اٹھایا جیسے پھول اٹھاتے ہیں۔ پھر کہا کہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے یا پٹخ کر واصل جہنم کروں۔ ساحر نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا' کلمہ پڑھا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ بس اسی دم باقی ساحروں نے بھی کہ اس کے لشکر میں شامل تھے کلمہ پڑھا اور مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

تب اس نے فاتحانہ قدم آگے بڑھایا اور قلعہ کی سمت بڑھا جس کے کنگرے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ مگر اس نے پھاٹک میں قدم رکھا ہی تھا کہ کنیزیں چلّائیں "نادان کیا کرتا ہے' یہ ملکہ مہتاب جادو کی محل سرا ہے۔ جو قدم رکھ لیا سو رکھ لیا۔ آگے حد ادب ہے۔ مقامات سحر ہیں۔ پچھتائے گا۔ جان سے ہاتھ دھوئے گا۔" وہ یہ کہتی تھیں کہ ایک ڈھڈو چمک چھلو اندر سے بھاگی ہوئی آئی۔ "مال زادیو! ملکہ کے مہمان کی شان میں گستاخی کرتی ہو۔ اس پہ گل پاشی کرو۔ راہ میں آنکھیں بچھاؤ۔" پھر شہزادے کا ہاتھ پکڑا اور اٹھلاتی ہوئی اندر چلی۔

شہزادے نے اندر حرم سرا میں قدم رکھا تو کیا دیکھا کہ ایک مہ لقا' گورا مکھڑا' آفت کا ٹکڑا' بال گھٹا سے' نین کٹیلے' ہونٹ رسیلے' گردن مورنی کی سی' گات ہری بھری' ٹھسے سے مسند پہ بیٹھی ہے۔ تورج فوراً ہی دل و جان سے فدا ہوا۔ مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ملکہ مسکرائی' اُٹھ کر شہزادے کا ہاتھ پکڑا اور اپنے قریب مسند پہ بٹھایا۔ پھر ساغر مئے ارغوانی سے لبریز پیش کیا۔ تورج غٹا غٹ پی گیا۔ مے اندر اتری تو جان میں جان آئی۔ دست درازی کی ہمت پیدا ہوئی۔ بوس و کنار کی نوبت آئی۔ آخر کے تئیں وصل کی گھڑی آئی۔ تب تورج کو ہوش آیا۔ اپنے آپ کو قابو میں کیا اور کہا' "اے دشمنِ ایمان' اس کام سے پہلے ایک کام ضروری ہے۔"

"وہ کون سا کام ہے۔" ملکہ نے حیران ہو کر پوچھا: "کیا اس کام سے مقدم کام بھی کوئی ہو سکتا ہے۔"

''ہاں ہو سکتا ہے اور ہے۔''

''وہ کون سا کام ہے۔''

''خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت کا اقرار۔''

''خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت کا اقرار۔'' ملکہ نے کسی قدر طنزیہ لہجہ میں دہرایا۔ تامل کیا۔ پھر بولی: ''ظالم تو نے عین وصل کی گھڑی میں یہ کیا عجب سوال بیچ میں لاڈالا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ع

جب عین مزے کا وقت آیا اس وقت وہ مرغا بول پڑا

ارے نادان' میرے بھولے شہزادے' خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت اپنی جگہ' معاملات وصل اپنی جگہ' دونوں کو گڈمڈ کرنا نادانی ہے۔ باعثِ پریشانی ہے حاصل اس کا پشیمانی ہے۔''

یہ سن کر تورج دلگیر ہوا اور بولا: ''اے مہ لقا کافرادا' تیرا یہ بیان کفر کا کلام ہے۔ دوزخ کی آگ اس کا انجام ہے۔ میرے خدا کو مان اور کلمۂ توحید پڑھ کر اپنے نفس کو پاک کر۔''

ملکہ بولی: ''اے جانِ من' مجھے تیرے حال پر افسوس ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ کیا ہم بستر ہونے کے لیے ہم مشرب ہونا ضروری ہے۔''

''ہاں' ہمارا دین یہی کہتا ہے۔'' تورج نے فخر اور اعتماد سے کہا'' ورنہ' یہ فعل سراسر گناہ ہے۔ سو میں نے سوچا ہے کہ یار جانی سے کلمۂ توحید پڑھواؤں۔ پھر اسے نکاح میں لاکر وظیفۂ زوجیت ادا کروں۔''

ملکہ نے زہر خند کیا اور بولی: ''عجب معشوق سے پالا پڑا ہے کہ شربت وصل کو وظیفۂ زوجیت کہتا ہے۔'' پھر رک کر بولی'' جانم' مبادا یہ مزے کی گھڑی قیل و قال میں ضائع ہو جائے۔ سو میں نے سوچا ہے کہ تیری مرضی کو پورا کروں۔ جلدی سے تیرے خدا

کی وحدانیت کا اقرار کروں، کلمہ پڑھوں اور وہ کام کہ جس میں، میرا اور تیرا دل اٹکا ہوا ہے شروع کروں۔"

بس پھر فوراً ہی ملکہ نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا اور کلمہ پڑھا۔ تورج نے اس طور عشق کی مہم سر کی۔ جلدی سے ملکہ کو اپنے رشتۂ مناکحت میں لایا اور فی الفور اس شہر خوبی کو آغوش میں سمیٹا۔ شربت وصل سے سیراب ہوا۔ سیراب کیا۔

صبح جب پو پھٹی، تورج بستر راحت سے اٹھا۔ غسل کیا۔ پھر وضو کر کے فریضۂ سحری ادا کیا۔ ساتھ میں دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھی کہ فریضۂ محبت اور فریضۂ دینی دونوں بخیر و خوبی انجام پائے۔ پھر ملکہ کے دست نازک سے جام مئے ارغوانی لے کر پیا۔ طبیعت میں سرور آیا۔ ملکہ کو آغوش میں لے کر خوب پیار کیا۔ پھر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلی مہم کے لیے مستعد ہوا۔

ملکہ یہ دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور دامن پکڑ کر بولی: "اے ستم شعار، یہ کیسی محبت تھی کہ ایک رات میں تمام ہوئی۔ سوچ کہ آگے تو کہاں جائے گا۔ مجھ ایسا دلدار کہاں پائے گا۔"

تورج جذبات سے مغلوب ہو کر بولا: "جاناں، رخصت کی یہ گھڑی مجھ پر بھاری ہے۔ تیری فرقت مجھے بہت تڑپائے گی۔ مگر کیا کروں، فرض سے مجبور ہوں۔ طلسم کشائی کا فریضہ مجھے پکار رہا ہے۔ جس طلسم میں قدم رکھا ہے اسے تسخیر کرلوں۔ پھر واپس تیرے شبستان محبت میں آؤں گا اور وصل کے مزے لوٹوں گا۔"

ملکہ بولی "نادان، یہ کیسا خیال خام تیرے دل میں سمایا ہے۔ طلسم کشائی کا حق تو ادا ہو چکا ہے۔ اس اقلیم طلسمات کا بڑا طلسم تو میں ہوں۔ مجھے تو نے تسخیر کیا۔ اب کس طلسم کی جستجو ہے اور کون سی اقلیم کی فتح کی آرزو ہے۔"

مگر توراج پر محبت کی ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ملکہ کو روتا ہوا چھوڑا اور

آگے روانہ ہوااور اب وہ اس بستی میں تھا جہاں اس کے لیے حیرت ہی حیرت تھی۔ ویسے تو یہاں کوئی ساحر مقابلہ میں نہیں آیا۔نہ کوئی عیار دکھائی دیا۔نہ کوئی گولہ پھٹا۔نہ کسی پنجہ نے اسے دبوچا۔ کس اطمینان سے وہ بستی میں داخل ہوااور آرام سے کوچہ و بازار کی سیر کرنے لگا۔ کوچوں میں گہما گہمی تھی۔ سقے مشکیں بھر بھر لا رہے تھے۔ چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ بچے بالے کھیل کود رہے تھے۔بڑے بوڑھوں میں کوئی لاٹھی ٹیکتا چلا جاتا ہے۔کوئی چھیل چھبیلا چھڑی گھماتا مٹر گشت کر رہا ہے۔کوئی مونچھوں پہ تاؤ دیتا اکڑتا بررتا پھر رہا ہے۔ دو کہاروں نے ایک ڈولی کاندھے پہ اٹھائی ہے اور تیزی سے گذرتے چلے جارہے ہیں۔ کوئی بگھی میں ٹھسے سے بیٹھا گویا ہوا کے گھوڑے پہ سوار اڑا چلا جارہاہے۔بازار میں گذر ہوا کہ دیکھا کٹورا بجتا ہے۔سقے آواز لگاتے ہیں"میاں آب حیات پلاؤں" کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ آدمی پہ آدمی گرتا ہے۔ ہزاری بزاری' دکانداروں کی موج ہے۔ سینکڑوں کا سودا دم کے دم میں ہوتا ہے۔

یہ ساری رونق برحق۔ پھر بھی تورج شک میں پڑا ہوا تھا۔ ہر صورت کو غور سے دیکھتا تھا۔ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ کیسے یہ آدمی ہیں' کیسی ان کی صورتیں ہیں۔ابھی وہ یہ سوچتا تھا کہ ایک شخص تیزی سے اس کے قریب سے کچھ اس رنگ سے گذرا کہ اس کی چال سے کھڑبڑ کا شور پیدا ہوتا تھا۔ یہ آدمی ہے یا لفافہ 'اس نے دل ہی دل میں سوچا اور ہنس پڑا۔ مگر وہ چند قدم چلا تھا کہ کتنے ہی لوگ اسے اسی طرح کھڑ بڑ کھڑ بڑ کے شور کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آئے۔اب تو واقعی اسے ایک حیرت نے آلیا۔اب جب اس نے غور سے دیکھا تو اسے لگا کہ یہ آدمی تو سب کاغذ کے پتلے ہیں۔ وہ حیرت سے اردگرد نظر ڈالتا بڑھا چلا جارہا تھا کہ ایک نانبائی کی دکان نظر آئی۔ دیکھا کہ ایک چٹائی پہ بیٹھے کچھ لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ ان کے مانگنے پر نانبائی نانوں سے بھری تھال سے نان نکال نکال کر دے رہا ہے اور وہ ذوق و شوق سے کھا رہے ہیں۔اسے محسوس ہوا کہ

اسے بھی بھوک لگ آئی ہے۔ بڑھ کر وہ بھی کھانے والوں میں شامل ہو گیا مگر جب نان ہاتھ میں آیا اور اس نے نوالہ توڑا تو وہ سخت پریشان ہوا کہ یہ تو کاغذ کا نان تھا۔ اس نے غصے سے نانبائی کو دیکھا اور کہا: "اے شعبدہ باز تو نے روٹیوں کا یہ کیا جعلی کاروبار شروع کیا ہے۔ کاغذ کی روٹیاں بناتا ہے اور گندم کی روٹیاں بتا کر بیچتا ہے۔"

نانبائی نے تعجب سے اسے دیکھا۔ پھر کھانے والوں کو مخاطب کیا۔ "صاحبو، دیکھتے ہو یہ اجنبی مجھے کیا تہمت لگا رہا ہے۔ روٹیاں تمہارے سامنے ہیں۔ سامری کو گواہ جان کر کہو کہ کیا یہ روٹیاں گندم کی نہیں ہیں۔"

سب نے بیک آواز کہا کہ "بیشک یہ روٹیاں گندم ہی کی ہیں۔" اور پھر وہ تورج کو لعنت ملامت کرنے لگے کہ: "اے اجنبی، تو عجب آدمی ہے کہ گندم کی ایسی سوندھی سوندھی روٹیوں کو کاغذ کی روٹیاں بتاتا ہے اور غریب نانبائی پر کاغذ کی ملاوٹ کی تہمت لگاتا ہے۔"

تورج سخت حیران و پریشان ہوا کہ یہ کیسے لوگ ہیں کہ کاغذ کی روٹیوں کو گندم کی روٹیاں جان کر کھا رہے ہیں۔ انہیں ذرا احساس نہیں کہ نانبائی ان کے ساتھ کیا دھوکہ کر رہا ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید کاغذ کی روٹیاں کھا کھا کر ہی وہ ایسے ہو گئے ہیں کہ اب کاغذ کے پتلے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی سمجھ پہ پتھر پڑ گئے ہیں کہ بے ایمان نانبائی کی بے ایمانی انہیں نظر ہی نہیں آتی۔ پھر اچانک اسے سوجھی کہ ضرور یہ نانبائی کوئی ساحر ہے۔ لوگوں پر ایسا سحر کیا ہے کہ انہیں کاغذ کی روٹی اب گندم کی روٹی نظر آتی ہے۔ سوچا کہ اس ساحر کو کیفر کردار کو پہنچاؤ اور ان لوگوں کو اس کے سحر سے نجات دلا کر خدا کی وحدانیت کا قائل کرو۔ وہ نیام سے تلوار نکالنے لگا تھا کہ سامنے نظر گئی۔ دیکھا کہ ایک عالیشان محل کھڑا ہے اور بلند و بالا دریچہ سے ایک نازنین جلوہ دکھاتی ہے۔ چہرہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ تورج پر تو جیسے کسی نے

جادو کر دیا ہو۔ باقی معاملات بھولا۔ فوراً گھوڑے پہ سوار ہو کر محل کی سمت میں چلا۔

محل کی ڈیوڑھی میں ایک ساحر کھڑا نگہبانی کرتا تھا اس نے تورج کو آتے دیکھا تو پکار کر کہا "اے شہسوار، کیا تو عقل سے پیدل ہے کہ اس طرف کا رخ کیا ہے۔ اس ڈیوڑھی میں قدم رکھنا موت کو دعوت دینا ہے۔"

تورج تھا کہ محبت کے نشہ میں بڑھے چلا جا رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھا تھا کہ قیامت آئی۔ ساحر نے کہ دیو کا دیو تھا، گرز اٹھایا اور تورج پہ حملہ آور ہوا۔ تورج نے اس کے وار کو خالی دیا اور فوراً ہی شمشیر کا ایسا وار کیا کہ ساحر کے سر سے گذری اور قدموں تک گئی۔ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ فوراً ہی اندھیرا چھا گیا اور ایک چیخ بلند ہوئی۔ میں مارا گیا، نام مرا اوراق جادو۔

جب اندھیرا دور ہوا تو تورج یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ساحر کی لاش غائب ہے۔ اس کی جگہ کاغذوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے۔ حیران کہ لاش کہاں گئی۔ کاغذوں کا یہ انبار کہاں سے آ گیا۔ ابھی وہ یہ سوچتا تھا کہ اندر سے ایک خادمہ دوڑی ہوئی آئی۔ بولی:

"اے جوان تجھے مبارک ہو۔ ہماری ملکہ قرطاس جادو تیری منتظر ہیں۔"

تورج لپک جھپک اندر گیا۔ ایوان میں قدم رکھا تو ملکہ جو ٹھسے سے بیٹھی تھی کھڑی ہوئی۔ شہزادے کا ہاتھ تھاما اور مسند پہ ساتھ بٹھایا۔ شراب انگوری سے جام بھرا اور اسے پیش کیا۔ تورج کو اس آن یاد آیا کہ کس طرح اس نے نانبائی سے روٹی لی تھی اور وہ کاغذ کی نکلی۔ تذبذب تھا کہ کہیں یہاں بھی ایسی ہی واردات نہ ہو جائے۔ ملکہ نے اس کے تذبذب کو دیکھا اور کہا "شہزادے میں تیرے تذبذب کو سمجھی۔ شاید تیرا دین تجھے اس لذت سے روکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو عرق ماءاللحم حاضر ہے ہر چند کہ وہ مئے ناب کا بدل نہیں ہے۔

شہزادے نے بلا تامل جواب دیا: "عرق ماءاللحم کو تو ہمارے جدامیر صاحب

قرآن شراب کا بدل جانتے ہیں۔ میرے لیے اس دستِ نازک سے شرابِ ناب کا جام نہ لینا کفرانِ نعمت ہے۔" یہ کہہ کر جام اس کے ہاتھ سے لے کر پیا اور اس کے لب شیریں کو بوسہ دیا۔ اور یہ بوسہ تو حرف آغاز تھا۔ پھر چل سو چل۔

ملکہ نے آخر اسے پیار بھرے انداز میں پرے دھکیلا۔ شہزادے تو تو بہت ندیدا نکلا۔ ارے میں کوئی بھاگی تھوڑا ہی جا رہی ہوں۔ یہ کیا کہ نہ دعا نہ سلام۔ چھوٹتے ہی بوس و کنار۔ ذرا پرے ہٹ کے بیٹھ۔ کچھ اپنی کہو' کچھ ہماری سنو۔"

سو پھر باتیں ہونے لگیں۔ تورج نے باتوں باتوں میں کہا: "اے ملکہ تیرا شہر عجب ہے۔ حیران ہوں کہ اس شہر سے آدمی کہاں غائب ہو گیا۔ اور یہ کاغذ کے پتلے کہاں سے آ گئے۔ اور اگر یہ آدمی ہیں تو ان پہ کیا افتاد پڑی کہ آدمی سے کاغذ کے پتلے بن گئے۔"

ملکہ مسکرائی اور بولی کہ "اے شہزادے' میں جانتی ہوں کہ تیرا دین یہی کہتا ہے کہ آدمی مٹی کا پتلا ہے۔ مگر یہ تو سوچ کہ دل تو ہر جسد میں دھڑکتا ہے' وہ مٹی کا ہو یا کاغذ کا ہو اور وصل کے لیے ہر دل تڑپتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تڑپنے والا مٹی کا پتلا ہے یا کاغذ کا آدمی۔"

تورج ملکہ کے منہ سے ایسی دانشمندی کی بات سن کر تڑپ گیا۔ ایسے ٹوٹ کر پیار کیا کہ چھوٹے کپڑے مسک گئے۔ آخر رہا نہ گیا بیتابانہ بولا: "شرابِ ناب بہت ہو گئی۔ اب شربت وصل کا سوال ہے۔"

ملکہ شرمائی اور بولی: "بندی کو اس سے انکار کب ہے۔"

مگر تورج نے عین اس گھڑی اپنا پرانا مطالبہ دہرایا: "مگر پہلے خداوند کریم کی وحدانیت کا اقرار کر اور کلمہ پڑھ۔"

ملکہ نے قہقہہ لگایا اور کہا: "جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔"

''کیا مطلب؟''

''میں نے یہ سن رکھا تھا کہ تو عین وصل کی گھڑی میں کلمہ کا سوال اٹھاتا ہے اور وصل کا سارا لطف غارت کر دیتا ہے۔'' اور پھر اس نے قہقہہ لگایا اور قہقہہ کے ساتھ جیسے کورے کاغذ کا تھان کھلتا چلا جا رہا ہو۔

تورج اس کے کاغذ آلود قہقہہ سے دہشت زدہ ہوا۔ غصہ بھی آیا۔ بولا: ''اب میں سمجھا' یہ رسیلے ہونٹ' یہ سخت کچیں' یہ ہری بھری گات' یہ سب دھوکا ہیں' تو بھی کاغذ کی نکلی۔'' تامل کیا۔ پھر بولا: ''ہاں' مزید سمجھا۔ یہ تیرا کاغذی سحر ہے کہ اس شہر میں آدمی اب آدمی نہیں رہے۔ کاغذ کے پتلے بن گئے۔'' یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔

ملکہ جواب تک مسکرا رہی تھی کسی قدر پریشان ہوئی۔ ''شہزادے' یہ کون سی ادا ہے کہ اپنی بندی کا پہلو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسی بے مروتی۔''

''میں اس کاغذی پہلو میں تھوڑا اور بیٹھا رہا تو میں بھی کاغذ کا بن جاؤں گا۔''

''وہ تو تو بن چکا ہے۔'' ملکہ نے زہر خند کیا ''ورنہ کوئی بھلا چنگا مرد اس طرح عین وصل کی گھڑی میں محبوبہ کے پہلو سے اٹھ کر راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔''

اس کلام نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔ کیا وہ واقعی کاغذی پتلا بن چکا ہے' یہ سوچ کر وہ سخت خوفزدہ ہوا اور تیزی سے محل سے نکلا۔ جب ڈیوڑھی سے نکل ہی رہا تھا تو اسے کنیزوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ کیا یہ مجھ پہ ہنس رہی ہیں۔ کیا ان کا بھی یہی گمان ہے کہ میں کاغذ کا بن چکا ہوں۔ باہر آ کر جلدی جلدی اس نے اپنا جائزہ لیا۔ نیام سے نکال کر اپنی شمشیر کو دیکھا' اپنے گھوڑے کو تھپتھپایا۔ پھر اطمینان کا سانس لیا کہ نہیں' میں کاغذ کا نہیں بنا ہوں۔ میں ہنوز آدمی ہوں۔

کس پُھرتی سے وہ گھوڑے پہ سوار ہوا۔ سوار ہوتے ہی مرکب کو چمکارا اور ایڑ

دی۔ وہ جلدی سے جلدی اس سحر زدہ شہر سے نکل جانا چاہتا تھا کہ جب تک وہ شہر میں ہے کاغذی پُتلا بن جانے کا اندیشہ ہے۔

شہر سے جب دور نکل آیا تب اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں۔ اب اس نے اطمینان کے ساتھ سر سے پیر تک اپنا جائزہ لیا کہ کہیں میں کاغذ کا تو نہیں بن گیا ہوں۔ ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے لمبا سانس لیا۔ شکر ہے اس پاک پروردگار کا جس نے مجھے اس ساحرہ کی قید سے چھٹکارا دلایا۔ کاغذی پتلا بننے سے بال بال بچا ہوں اور اس آن اسے گمشدہ لوح یاد آئی۔ ایک پچھتاوے نے اسے آلیا۔ میں مرد غازی ہو کر کتنا سادہ لوح ہوں کہ ساحراؤں کے دام میں پھنس جاتا ہوں۔ ان کی کافر ادائی مجھ پہ عجب سحر کرتی ہے کہ میں اپنے تبلیغی فریضہ کو بھول جاتا ہوں۔ شوق وصل میں کھو جاتا ہوں۔ میری اسی کمزوری سے اس کمبخت ساحرہ نے فائدہ اٹھایا اور عین وصل میں مجھے غافل پاکر لوح اتار لی۔ اپنے اس کمزور لمحہ کو یاد کر کے وہ کتنا پچھتایا' کتنی اپنے آپ پر نفرین کی۔ آج وہ لوح میرے پاس ہوتی تو میں بھلا اس طرح منہ چھپا کر وہاں سے بھاگتا۔ مردانہ وار اس ساحرہ سے مقابلہ کرتا۔ اسے زیر کر کے اس سے خدا کی وحدانیت کا اقرار کراتا۔ پوری بستی کو اس کاغذی سحر سے نجات دلاتا اور ان گمراہ لوگوں کو صراطِ مستقیم پر لاتا۔ مگر حیف کہ لوح میں عشق و عاشقی کے چکر میں گم کر بیٹھا۔ سو اب مجھے اس رسوائی کا سامنا ہے کہ اس بستی کو میں ساحری اور کافری کے جال سے نہ نکال سکا اور ایک ساحرہ کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر میں نے وہاں سے راہ فرار اختیار کی مگر خیر میں تو اس دام سے بچ کر نکل آیا۔ اس نے اپنے آپ کو دلاسا دیا مگر فوراً ہی اسے ایک مرتبہ پھر کچھ شک گذرا۔ سو ایک مرتبہ پھر اس نے اپنا جائزہ لینا شروع کیا۔

ازسرِنو جائزہ لینے کے بعد اس نے طے کیا کہ نہیں اس کا کچھ نہیں بگڑا ہے۔ وہ اپنی اس غازیانہ شان کے ساتھ گوشت پوست والا آدمی ہے۔ پھر اس نے فخر کے

ساتھ سوچا کہ اس کافر ملکہ نے کتنے شہزادوں کتنے اور شہسواروں کو اپنے حسن کے جال میں پھنسایا اور کاغذ کا پتلا بنا کر اپنی دہلیز کا قیدی بنالیا۔ ایک میں ہوں کہ بچ کر نکل آیا۔ پھر اس نے قریب بہتی ندی پر جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ وضو کیا اور شکرانے کی دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر گھوڑے پہ سوار ہوا اور آگے بڑھا۔

گھوڑا اب طرارے بھر رہا تھا اور اگلی مہم کے تصور نے اس کی طبیعت میں جولانی پیدا کر دی تھی۔ اسی ہنگام اچانک اسے وہ شیریں لمحہ یاد آیا جب وصل کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ ذرا دیر کو وہ اس لمحہ کے سحر میں رہا مگر جلد ہی اس نے اس تصور کو جھٹک کر دفع کیا۔ اچھا ہی ہوا ورنہ میں بھی کاغذی بن چکا ہوتا اور پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ دی اور اگلی مہم کے تصور میں گم ہو گیا۔ مگر پھر بھی بیچ بیچ میں اسے لگتا تھا کہ وہ شیریں لمحہ اس کے آس پاس منڈلا رہا ہے اور جیسے اس کے اندر کاغذ ایسی کوئی شے ر'ک رہی ہے اور اسے گمان ہوا کہ ملکہ کا کاغذی سحر ہنوز اس کے تعاقب میں ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر گھوڑے کو ایڑ دی اور وہ گھوڑا دم کے دم ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

ہم نوالہ

یہ میری شب گردیوں کے زمانے کا ذکر ہے۔ ساری بے راہ روی کے باوجود
میں نے اپنے اوپر ایک پابندی ضرور لگا رکھی تھی کہ رات کے جس پہر میں بھی گھر لوٹ
کر آؤں کھانا مجھے بہر حال گھر ہی پر کھانا چاہیے۔ اس ضابطہ پر میں سختی سے کاربند تھا۔
میری والدہ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اسے ہی بہت غنیمت سمجھتی
تھیں کہ بیٹا رات کے جس پہر میں بھی آئے بہر حال آکر گھر ہی میں سوتا ہے اور گھر
ہی پہ کھانا کھاتا ہے۔ وہ بھی پابندی سے اس وضع کو نبھاتی تھیں کہ رات کا کھانا میرے
کمرے میں میرے پلنگ کے برابر والی میز پر چن کر اسے سرپوش سے ڈھانک دیتیں۔

تو میرا روز کا یہ معمول تھا کہ رات گئے گھر واپس آتا۔ میز پر چنا ہوا ٹھنڈا کھانا
جلدی جلدی کھاتا اور چادر تان کر سو جاتا۔ صبح پھر دیر ہی سے اٹھتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے
احساس ہوا کہ جب میں سرپوش اٹھا کر کھانے بیٹھتا ہوں تو اوپر کنگنی پر پہلے تھوڑی
حرکت ہوتی ہے اور پھر چوں چوں کی آواز آنی شروع ہو جاتی ہے۔ کنگنی پر میرے عین
سرہانے ایک چڑے چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کے تنکے میرے بستر پر
گرے نظر آتے تھے۔ مگر میں نے تو چڑے چڑیا کے رہائش کے حق کو تسلیم کر رکھا تھا اس

لیے مجھے کبھی بستر پر ان تنکوں کے گرنے پر کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ میں یہ سوچ کر درگذر کرتا رہا کہ انہوں نے اگر کنگنی پر اپنا گھونسلا جمالیا ہے تو میرا کیا لیتے ہیں۔ دو چار تنکے اگر بستر پر آگرتے ہیں تو بستر ان سے کونسا ایسا میلا ہو جاتا ہے۔ تولیہ سے ذرا جھاڑ دیا۔ لیجئے بستر پھر صاف ستھرا ہو گیا۔ مگر اب انہوں نے ایک قدم اور بڑھایا پہلے تو یہی ہو تا رہا کہ میں نے سرپوش اٹھا کر کھانا شروع کیا اور ادھر گھونسلے میں حرکت شروع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی چوں چوں کی آوازیں۔ پھر یہ ہوا کہ چڑیا گھونسلا سے نکل کر پُھر سے اڑتی اور کمرے کے دوسرے کنارے کنگنی پر جا بیٹھتی۔

مجھے کئی مرتبہ خیال آیا کہ میں جو رات کو بے وقت آتا ہوں ایسے وقت جب ساری خلقت نیند میں غرق ہوتی ہے اور کمرے کی خاموشی ٹوٹتی ہے اس سے چڑے چڑیا کے آرام میں خلل پڑتا ہے مگر رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہ ان کے آرام میں خلل پڑنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے۔ میں کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کلی کرنے کے لیے باتھ روم میں چلا جاتا۔ ایک دفعہ باتھ روم سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چڑیا میز پر آن بیٹھی ہے اور روٹی کا جو ایک ٹکرا پلیٹ میں پڑا رہ گیا ہے اس کے ساتھ کشتم کشتا کر رہی ہے۔ یہ دیکھ دوسرے دن میں نے یہ کیا کہ جو ٹکڑا نوالہ میرے کھانے سے بچ گیا تھا' اسے ریزہ ریزہ کر کے پلیٹ میں بکھیر دیا اور خود باتھ روم میں چلا گیا۔ باتھ روم سے نکلنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چڑیا جلدی جلدی ریزے چگ رہی ہے۔ چڑا شاید زیادہ احتیاط پسند تھا۔ وہ پہلے چڑیا کو چگتے دیکھتا رہا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے تو وہ بھی پُھر کر کے نیچے اتر آیا اور چڑیا کے ساتھ شریک ہو گیا۔ مگر ادھر میں نے باتھ روم سے قدم باہر نکالا اور وہ دونوں پھرر کر کے اڑے اور واپس کنگنی پہ جا بیٹھے۔

پھر ان کا حوصلہ مزید بڑھا۔ اب وہ میرے باتھ روم جانے کا بھی انتظار نہیں

کرتے تھے۔ میرے کھانا کھانے کے بیچ ہی میز پہ دھاوا بول دیتے۔ اصل میں انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ یہ شخص جس کے رزق میں ہم حصہ بٹا رہے ہیں بالکل بے ضرر ہے۔ اگر تھوڑی بہت احتیاط برتی بھی جاتی تو چڑے کی طرف سے کہ وہ میرے ہوتے ہوئے میز پر آکر بیٹھتا اور پتہ نہیں اسے کیا شک گذرتا کہ اڑ کر پھر کنگنی پر جا بیٹھتا۔ پھر دوسری بار آتا تو پہلے آتش دان کی کارنس پر آکر تھوڑی دیر چوں چوں کرتا، پھر تھوڑا حوصلہ کرکے میز پر آن بیٹھتا۔ مگر مستقل چوکنا رہتا۔ چڑیا کے یہاں ایسا کوئی اندیشہ اب نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اچھی خاصی بے تکلفی کے ساتھ میرے کھانا کھانے کے بیچ میز پر آن بیٹھتی اور میرے سامنے رکھی ہوئی روٹی پر چونچیں مارنی شروع کر دیتی۔ پھر میرے لیے اس کے سوا کیا چارہ رہ جاتا تھا کہ کھانے کے بیچ روٹی کا ٹکڑا توڑ کر ریزہ ریزہ کرکے میز پر بکھیروں اور اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لوں۔

اس عمل میں کبھی کبھی مجھے اپنے میاں مٹھو کا خیال آجاتا اور یہ سوچ کر دل ہی دل میں مسکراتا کہ اگر اس میاں کو پتہ چل گیا کہ میں نے ایک چڑیا سے فلرٹ کرنا شروع کر دیا ہے تو وہ ٹیں ٹیں کرکے گھر میں حشر بپا کر دیں گے۔ اصل میں ان دنوں ہمارے گھر میں ایک تو ایک طوطا پلا ہوا تھا جسے سب گھر والے میاں مٹھو کہتے تھے۔ جہاں اس کا پنجرہ رکھا تھا اس کے برابر ایک چھوٹی سی کابک رکھی تھی۔ ان دنوں میاں مٹھو کے ساتھ کبوتروں کے دو جوڑے بھی ہمارے دالان اور آنگن کی رونق تھے۔ میں صبح ناشتہ اسی دالان میں میاں مٹھو کے قریب بیٹھ کر کرتا تھا۔ اور میرا یہ طریقہ تھا کہ ناشتے میں جو کچھ بھی ہوتا اس میں سے تھوڑا تھوڑا مٹھو کو بھی پیش کر دیتا۔ یوں مٹھو سے میرا دوستانہ بڑھتا چلا گیا۔ سمجھ لیجئے کہ صبح کا ناشتہ ہم دونوں مل کر کرتے تھے۔

قریب ہی کبوتر دانہ چگتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی ایک کبوتر مٹر گشت کرتے کرتے میرے قریب آگیا۔ میں نے توس کے چند ریزے اس کے

سامنے ڈال دیئے۔ اس نے بڑے شوق سے ان ریزوں کو چگنا شروع کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے کبوتر بھی لپک جھپک آن موجود ہوئے۔ میری طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہمارا حصہ کہاں ہے۔ میں نے آدھے پونے توس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور ان کے سامنے بکھیر دیئے۔ بس وہ چاروں پانچوں کبوتر انہماک سے وہ ریزے چگنے لگے۔

مگر میں نے یہ دیکھا کہ مٹھو نے میرے اس فعل کو پسند نہیں کیا۔ اس نے ٹرٹر ایسی آوازیں نکالنی شروع کر دیں جیسے کبوتروں سے اپنی بیزاری کا اظہار کر رہا ہو۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ کبوتروں سے میرا یہ خلوص اسے پسند نہیں آیا۔ وہ اس پر احتجاج کر رہا تھا۔

میں نے مٹھو کے احتجاج کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مٹھو کو ناشتہ دینے کے بعد اب میں کبوتروں کی بھی تھوڑی تواضع کرنے لگا۔ مٹھو تھوڑا ٹرٹر کرتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔

ایک صبح ایسا ہوا کہ کبوتروں کو اپنے گرد منڈلاتا دیکھ کر میں نے سوچا کہ شاید کچھ زیادہ ہی بھوکے ہیں۔ تو پہلے تھوڑی ان کی تواضع کر دوں۔ پھر مٹھو کو اطمینان سے کھلائیں پلائیں گے۔ مٹھو یہ دیکھ کر پہلے تو ٹرٹرایا اور پھر جیسے اس کی زبان کو تالا لگ گیا۔ میں نے کبوتروں کے سامنے پراٹھے کے ریزے ڈال کر فوراً مٹھو کے لیے پراٹھے کا ایک بڑا سا نوالہ توڑا۔ سوچا کہ آج روکھے پھیکے توس نہیں ہیں۔ پراٹھا ہے۔ مٹھو میاں پراٹھا شوق سے کھاتے ہیں۔ تو آج وہ بہت خوش ہوں گے۔ اور خوب کتر کتر کر پراٹھا کھائیں گے۔ مگر واں تو کچھ اور رنگ نظر آیا۔ مٹھو نے پراٹھے کا نوالہ چونچ میں پکڑنے کی بجائے چونچ زور سے میری انگلی پر ماری۔ میں بلبلا گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا۔ پھر نوالہ پنجرے کے اندر ڈالنے کی کوشش کی تو پھر مٹھو مجھ پہ حملہ آور ہوا۔ اب میں

سمجھا مٹھو کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ میں نے پہلے کبوتروں کی تواضع کی۔ پھر مٹھو کا خیال آیا۔ گویا مٹھو مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔ میں نے اسے منانے کی کوشش کی۔ کتنے پیار سے بار بار کہا' میاں مٹھو بی جی بھیجو اور مٹھو ہر بار ناراضگی کے لہجہ میں ٹیں کی آواز نکالتا اور پروں میں چونچ دے کر آنکھیں موند لیتا۔ میں نے بہت منت سماجت کی مگر مٹھو کو نہیں سننا تھا' نہیں سنا۔ اس صبح میں نے بہت بے دلی سے اکیلے ناشتہ کیا۔

اگلی صبح مٹھو پھر ہشاش بشاش تھا۔ خوب چہک رہا تھا اور ناشتے میں اپنے حصے کا تقاضا کر رہا تھا۔ جب مٹھو کی طبیعت سیر ہو گئی اور میں بھی اس سے باتیں کر کے سیر ہو چکا تب میں نے کبوتروں کی طرف توجہ کی۔ کبوتروں نے اس دوران میری بے توجہی کا کوئی برا نہیں مانا۔ کبوتروں میں یہی تو اچھی بات ہے تم ان سے اچھا برا کیسا ہی سلوک کرو' ان کے دل پر میل نہیں آتا۔ آدمیوں سے اتنی لمبی صحبت کے باوجود آدمیوں والا کوئی عیب ان میں نہیں پایا جاتا۔ غصہ' نفرت' کدورت' کینہ' کوئی ایسی بات ان میں نظر نہیں آئے گی۔ طوطوں میں بہت خوبیاں ہونے کے ساتھ ایک بڑا عیب یہ ہے کہ صحبت کا اثر اس پر بہت جلد ہوتا ہے۔ آدمیوں کی طرح باتیں کرنے تک یہ اثر محدود نہیں ہوتا۔ آدمیوں کی صحبت میں رہ کر اس نے ان کے بہت سارے عیب اپنا لیے ہیں۔ یہی دیکھ لو کہ ایک دفعہ میں نے اس سے پہلے کبوتروں کی تھوڑی خاطر تواضع کر دی تو اس نے کتنا برا مانا۔ اس کے چند دنوں بعد میں نے ذرا آزمانے کے لیے دو چار بار پھر یہی کیا کہ اس سے پہلے کبوتروں کی تواضع کی۔ توسوں میں سے ٹکڑا توڑ کر ان کے ریزے ان کے سامنے ڈال دیئے اور ہر مرتبہ مٹھو نے اسی طرح احتجاج کیا۔ کبوتروں کو اس نے خواہ مخواہ اپنا رقیب سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ادھر کبوتروں کا یہ حال کہ مٹھو کے فعل کا جیسے انہوں نے نوٹس ہی نہیں لیا ہو۔ وہ اپنے آپ میں مگن غٹرغوں غٹرغوں کرتے رہتے تھے۔ شاید یہ صوفیا کی صحبت کا اثر ہو۔ کتنے زمانے سے اولیاء اللہ کی

درگاہوں سے پیوستہ چلے آ رہے ہیں۔ اتنی لمبی وابستگی بے اثر تو نہیں جا سکتی تھی۔ یا ممکن ہے کہ صوفیوں والی صفت ان میں پہلے سے موجود ہو اور اس کی وجہ سے ان کے یہاں درگاہوں سے رغبت پیدا ہوئی ہو۔ اب یہی دیکھ لو کہ وہ ہر وقت غٹرغوں غٹرغوں کرتے رہتے ہیں تو اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ اور غٹرغوں غٹرغوں تو ہمیں آپ کو سنائی دیتی ہے۔ اصل میں تو ہماری والدہ کے بقول وہ یا غفور یا غفور کا ورد کرتے ہیں۔

اے لو، میں کدھر بہہ گیا۔ ذکر اس چڑیا کا تھا جس سے میری افہام و تفہیم اس حد تک ہو گئی تھی کہ وہ میری ہم نوالہ بن گئی تھی اور اس کی دیکھا دیکھی چڑا بھی مجھ سے اب اچھا خاصا مانوس ہو چلا تھا۔ اس ذکر پر مجھے مٹھو کا خیال آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مٹھو کا پنجرہ میرے کمرے میں نہیں ہوتا۔ اگر کہیں وہ یہ دیکھ لیتا کہ ایک چڑیا سے میری کتنی گاڑھی چھننے لگی ہے تو وہ تو حشر برپا کر دیتا۔

اب میں حیران ہو کر سوچتا ہوں کہ مٹھو کو تو میری اس نئی دوستی کا علم ہی نہیں تھا پھر کس کی نظر اس دوستی کو لگی۔

ایک رات جب میں گھر لوٹا تو خلاف معمول کمرے کا دروازہ بند دیکھا۔ میرا کمرہ بالعموم کھلا رہتا تھا۔ میں نے کبھی یہ تکلف نہیں برتا کہ گھر سے نکلتے وقت کمرے کا دروازہ بند کر دوں۔ والدہ کو بھی اسی میں سہولت نظر آتی تھی کہ دروازہ کھلا رہے۔ میرے جانے کے بعد وہ کمرے کی صفائی ستھرائی کر دیتی تھیں۔ رات کو کھانا میز پر چن کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتی تھیں مگر آج میں نے دیکھا کہ دروازہ بند ہے اور تالا لگا ہوا ہے۔ دروازے کے بند ہونے کی توجیہہ تو میں نے فوراً ہی کر لی کہ آج شام آندھی آ گئی تھی۔ ساتھ میں بارش بھی شروع ہو گئی۔ گرد اور بوچھاڑ سے تحفظ کے نقطۂ نظر سے کمرے کا دروازہ بند کیا گیا ہو گا مگر تالا کس خوشی میں لگا تھا۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو والدہ نے تالا کھولتے کھولتے بتایا کہ "آمنہ آئی ہے۔ اس کے بچوں

نے تو سارے گھر ہی کو الٹ پلٹ کر دیا۔ توبہ توبہ ایسے بے کہنے بچے تو ہم نے کہیں دیکھے ہیں۔ بانس کہیں رکھا مل گیا۔ اسے لے کے اس کمرے میں گھس پڑے کہ چڑیا پکڑیں گے۔ مشکل سے انہیں نکالا۔ پھر میں نے کمرے میں تالا ڈال دیا۔"

میں نے بے توجہی سے اس قصے کو سنا اور جلدی جلدی کپڑے بدلنے کے بعد کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ آج چڑیا کھانے میں شریک نہیں ہے۔ اس کی چوں چوں کی آواز بھی نہیں آئی۔ کنگنی پر جہاں اس کا گھونسلا تھا نظر ڈالی۔ نہ چڑیا نظر آئی نہ چڑا۔ یا اللہ دونوں کہاں گئے۔ پھر روشندان پر نظر گئی۔ دیکھا کہ روشندان بند ہے مگر اسے کس نے بند کیا۔ کیا بچوں نے بانس سے اسے بند کیا کہ چڑیا اس راستے سے باہر نہ نکل جائے۔ یا والدہ نے آندھی اور بوچھاڑ کے پیش نظر اسے بند کیا۔ بہر حال جس نے بھی اور جس مقصد سے بھی بند کیا ہو' مطلب تو یہ نکلا کہ چڑا چڑیا جب بچوں کی زد سے بچ کر باہر اڑ گئے تو پھر واپسی کے سب راستے ان پر بند ہو گئے۔ اس خیال نے مجھے بہت پریشان کیا۔ آندھی اور بارش میں باہر انہیں کہاں پناہ ملی ہو گی۔

اس وسوسہ نے مجھے کھانا بھی اطمینان سے نہیں کھانے دیا۔ یوں بھی میں تو اب اس کا عادی ہو گیا تھا کہ ادھر میں نے کھانا شروع کیا ادھر چڑیا پُھر سے اُڑ کر نیچے اتری اور میز کے ایک کنارے پر آ بیٹھی۔ میں نے ایک نوالے کے ریزے کر کے اس کی طرف بکھیر دیئے۔ اس نے ٹھگنا شروع کر دیا۔ پھر چڑا آ جاتا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ٹھگنے میں شریک ہو جاتا اور میں سمجھتا کہ ہم مل جل کر کھانا کھا رہے ہیں۔ آج دستر خوان کے یہ شریک غائب تھے۔

صبح اٹھ کر میں سیر کے لیے باہر نکلا تو دیکھا کہ اندھی اور بارش نے اچھی خاصی تباہی پھیلائی ہے۔ ہمارے پڑوس میں جو ایک لانڈری تھی اس کا سائن بورڈ بیچ گلی میں گرا پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک پیپل کھڑا تھا اس کے کتنے ہی گدے ٹوٹ کر اس

طرح گرے تھے کہ رستہ کم و بیش مسدود ہو گیا تھا۔ چیتھڑے گودڑے 'خستہ حال گتے' میلے بوسیدہ کاغذ' شیشے 'اور جانے کیاالا بلا بکھری پڑی تھی۔ انہیں کے بیچ اِکا دُکا چڑیوں کی لاشیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ موسم ٹھنڈا ضرور ہو گیا تھا مگر تباہی کے اس منظر نے موسم کی خوشگواری کا رنگ اچھا خاصا کاٹ دیا تھا۔

رات گئے جب میں گھوم پھر کر گھر واپس آیا تو پھر کھانا کھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ کنگنی سے نہ چوں چوں کی آواز آئی نہ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے بہت بے دلی سے کھانا کھایا۔ بس پھر جیسے رات کے میرے کھانے سے لذت جاتی رہی ہو۔ پھر یہ لازم بھی نہیں رہا کہ ضرور گھر آ کر ہی کھانا کھاؤں۔

مانوس اجنبی

میرے ارادے کا اس میں ایسا کوئی دخل نہیں تھا۔ بس محفل خود بخود ہی آراستہ ہوتی چلی گئی۔ میں نے اس گھر میں آکر اگر برآمدے میں بیٹھ کر ناشتہ کرنا شروع کیا تھا تو اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ سامنے صحن میں ایک امرود کا درخت کھڑا تھا۔ قریب ہی میں نے ایک کیاری بھی بنائی تھی جس میں مختلف پودے لگائے تھے۔ جب پھول آتے تھے تو یہ پودے بہت بھلے لگتے تھے۔ آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں طراوٹ اترتی محسوس ہوتی تھی۔ تو بس مجھے یہ اچھا لگتا تھا کہ صبح کھلی فضا میں بیٹھ کر ناشتہ کروں اور اخبار پڑھوں۔ فطرت سے رشتہ قائم کرنے والے تو خالی ایک پودے کے وسیلہ سے بھی یہ رشتہ قائم کر لیتے ہیں اور یہاں تو پودوں کے سوا ایک ہرا بھرا امرود کا پیڑ بھی تھا۔

مگر بہت جلد ایسا ہوا کہ میرے ناشتہ کے اوقات میں ایک چڑیا نے میرے آس پاس منڈلانا شروع کر دیا۔ میں نے ایک دو دفعہ ازراہِ مروت توس کے کچھ ریزے میز کے قریب فرش پر بکھیر دیئے۔ بس وہ ہل گئی اور مجھ سے بے تکلف ہوتی چلی گئی۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک دو اور چڑیوں نے بھی میرے گرد منڈلانا شروع کر دیا۔ میں نے

محض ان چڑیوں کی سہولت کی خاطر توس کے ریزے فرش پر ڈالنے کے بجائے امرود کے درخت کے سائے تلے بکھیرنے شروع کر دیئے۔ چڑیوں نے واقعی بہت سہولت محسوس کی۔ اب وہ زیادہ اطمینان کے ساتھ توس کے ریزے چگتی نظر آتی تھیں۔ اور اب چڑیوں کی تعداد دیکھ کر میں نے ان کے راشن میں اچھا خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ یہ اضافہ مجھے اس لیے بھی کرنا پڑا کہ اب بلبلوں کا ایک جوڑا بھی یہاں آن پہنچا تھا اور چڑیوں کے دانے دنکے میں حصہ دار بن گیا تھا۔

پھر میں نے یہ سوچ کر کہ آخر کھانے کے بعد پانی کی بھی تو طلب ہوتی ہے درخت تلے ایک کونڈا رکھ دیا جو مستقل پانی سے لبریز رہتا اور اب کسی کسی صبح میں یہ منظر دیکھتا کہ چڑیاں ایک ایک کر کے کونڈے میں غوطے لگا رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہوا کہ ہفتے عشرے میں ایک دو دن ایسے بھی آتے ہیں جب چڑیاں باجماعت اشنان کرتی ہیں۔

اب کبھی کبھی ایک فاختہ بھی یہاں اتر آتی تھی۔ مگر اسے چڑیوں کے دانے دنکے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو بس پانی کے ایک دو گھونٹ لیتی۔ ارد گرد پھیلی ہوئی گھاس میں تھوڑی چہل قدمی کرتی اور اڑ جاتی۔

میں نے سوچا کہ فاختہ شاید توس کے ریزوں اور روٹی کے ٹکڑوں سے مانوس نہیں ہے۔ باجرہ اگر ہو تو شاید یہ چگنا پسند کرے گی۔ سو میں نے تھوڑے سے باجرے کا اہتمام کیا مگر فاختہ نے باجرے سے بھی بے نیازی برتی۔ اس نے جیسے طے کر لیا تھا کہ یہاں آکر بس پانی پینا ہے۔ کھانے دانے میں شرکت نہیں کرنی ہے۔ باجرے کو چڑیوں نے بھی منہ نہیں لگایا۔ وہ روٹی، پراٹھے اور توس کے ریزوں سے اتنی مانوس ہو گئی تھیں کہ اب انہیں باجرہ جیسی روکھی سوکھی غذا بالکل پسند نہیں آتی تھی۔

پھر ایک گرسل کے جوڑے نے یہ گھر دیکھ لیا۔ عین اس وقت جب میں روٹی

کے یا توس کے ریزے بکھیر چکتا دو گرسلیں اڑتی اڑتی آتیں۔ پہلے منڈیر پر بیٹھ کر گرد و پیش کا جائزہ لیتیں۔ پھر نیچے اتر آتیں۔ ان کی آمد کو شاید چڑیوں نے پسند نہیں کیا۔ ان کے ہوتے ہوئے وہ تھوڑی بے آرامی محسوس کرتیں۔ لیکن سب سے زیادہ پریشان وہ اس وقت ہوئیں جب ایک گلہری ان کے بیچ آن دھمکی اور ان کے کھانے دانے میں شریک غالب بن گئی۔ یہ گلہری ایک صبح اچانک نمودار ہوئی۔ وہ تیزی سے امرود کی شاخوں کے بیچ سے سرسراتی ہوئی تنے کے سہارے نیچے اتری اور فوراً ہی ادھر ادھر دیکھے بغیر کھانے پر منڈھ گئی۔ چڑیوں نے پریشان ہو کر اسے دیکھا اور تتر بتر ہو گئیں۔ خیر یہ اچھا ہوا کہ جس تیزی سے وہ آئی تھی اسی تیزی سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے پر چڑیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ واپس آئیں اور ریزے چگنے میں مصروف ہو گئیں۔

پھر تو گلہری کو چاٹ لگ گئی۔ اس نے روز آنا شروع کر دیا۔ روز آندھی دھاندی آتی اور کھانے پر جت جاتی۔ بیچاری چڑیاں پریشان ہو کر تتر بتر ہو جاتیں مگر گلہری تو ایک بیقرار روح ہے۔ کسی بھی جگہ خواہ وہ اسے کتنی ہی مرغوب ہو وہ زیادہ دیر تک ٹک نہیں سکتی۔ طبیعت میں قرار نہیں ہے۔ یہ آئی وہ گئی۔ مگر ان چند گھڑیوں میں کیا قیامت مچاتی تھی۔ چڑیوں کی سبھا درہم برہم ہو جاتی تھی۔

اس سبھا کو دو ڈھائی دفعہ ایک کوے نے بھی درہم برہم کیا۔ اس کے جارحانہ رویے سے چڑیاں سہم جاتیں۔ جتنی دیر وہ وہاں رہتا چڑیوں کو کھانے دانے کے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ مجھے کوے کی یہ جارحانہ روش مطلق پسند نہیں آئی۔ میرا تو جو بھی رشتہ اور تعلق تھا وہ چڑیوں سے تھا نہ کہ اس کالے کلوٹے کوے سے۔ اس کے آتے ہی میں چھڑی لے کر کھڑا ہو جاتا۔ کوے کو بھاگتے ہی بنتی۔ رفتہ رفتہ اسے احساس ہو گیا کہ اس کے لیے یہاں حالات مطلق سازگار نہیں ہیں۔ پھر اسے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ

یہاں تو توس کے' روٹی کے' یا پراٹھے کے ریزے ہوتے ہیں۔ ریزوں کے لیے اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ سو وہ جلد ہی یہاں سے کنارہ کر گیا۔

تو کوے کی حد تک تو میں نے چڑیوں کے جذبات کا پورا احترام کیا۔ اسے یہاں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا مگر گلہری کے معاملہ میں میں یہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایسی ویسی مخلوق تو نہیں ہے۔ گلہری نے سری رام چندر جی کی آنکھیں دیکھ رکھی ہیں۔ لنکا کی چڑھائی کے سمے ہندوستان اور لنکا کے درمیان جو پل بنا تھا اس کی تعمیر میں اس نے حصہ لیا ہے۔ بندروں نے اس کے ساتھ جب بدسلوکی کی تو انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ رام چندر جی نے اس کی دلجوئی کی۔ اس کی پشت پر جو لہریا بنا ہوا ہے یہ انہیں کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ انہوں نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تھا۔ اور جس طرح وہ اکڑوں بیٹھ کر توس کے ریزے پنجوں میں پکڑ کر کھا رہی تھی اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس کے یہاں یہ آدمیت جو آئی ہے وہ بھی رام چندر جی کی صحبت کا فیض ہے۔ اس صحبت میں اس نے یہ سیکھا کہ تمیز کی بات یہی ہے کہ جو کھاؤ ہاتھ میں لے کر کھاؤ۔ سو یہ باتیں میرے سامنے تھیں۔ بھلا میں کیسے اسے اس طرح دھتکارتا جیسے کوے کو دھتکارا تھا۔

مطلب یہ کہ مجھے چڑیاں بھی عزیز تھیں اور گلہری بھی۔ سو میں ان دونوں کے بیچ غیر جانبدار ہو گیا۔ پھر جیسے چڑیوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اب وہ گلہری کی آمد پر پہلے کی طرح پریشان ہو کر تتر بتر نہیں ہوتی تھیں۔ بس تھوڑا سرک جاتی تھیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے زیادہ دیر یہاں ٹکنا نہیں ہے اور واقعی گلہری اس طرح آتی جیسے وہ کوئی ضروری کام بیچ میں چھوڑ کر آئی ہے اور ضروری کام یہاں انجام دے کر الٹے پیروں چلے جانا ہے۔ لپک جھپک آئی' جلدی جلدی تھوڑے ریزے پنجے سے چنے' جلدی جلدی انہیں کھایا اور یہ جا وہ جا۔ شتابی آئی' شتابی گئی' چڑیاں جو اس

کے آنے پر پرے ہٹ جاتیں دوبارہ آتیں اور چگنے میں منہمک ہو جاتیں۔

امرود کے پیڑ میں آخر وہ کون سا کھلکھل تھا جس میں یہ گلہری رہتی تھی۔ مجھے تو کبھی اس کا پتہ چلا نہیں۔ وہ تو چھلاوا تھی چھلاوا۔ پتوں میں جا کر اس طرح سٹکتی تھی کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ گئی کہاں۔

ہاں صبح کے اوقات ہی میں کبھی کبھی مجھے اوپر آسمان کی بلندیوں میں ایک ہری لکیر تیزی سے کھنچتی اور گذرتی نظر آتی۔ طوطوں کی یہ قطار شور مچاتی تیزی سے گذر جاتی۔ یااللہ یہ کونسے باغ سے آتے ہیں اور کونسے باغ میں جا کر اتریں گے۔ بلندی میں اڑتے ہوئے پرندے مجھے ہمیشہ کسی دوسری ہی دنیا کی مخلوق نظر آئے۔ بس یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کہیں بلندیوں ہی میں رہتے ہیں۔ اگر نیچے اترتے بھی ہیں تو کسی دور کی اقلیم میں، کوئی ایسی اقلیم جو زمین پر آسمان کا ٹکڑا ہے، جس کی جھیلیں آسمانی ہیں اور باغ ماورائی شان رکھتے ہیں۔ بلندیوں میں تیزی سے گذرتی چہکتی سبز ڈار کو دیکھتے ہوئے مجھے کبھی یہ دھیان نہیں آیا کہ ہمارے برآمدے میں لٹکے ہوئے پنجرے میں جو ایک طوطا چہکتا رہتا تھا وہ اسی ڈار سے بچھڑا ہوا پرندہ تھا۔ اچھا کیا واقعی وہ پرندہ تھا۔ پرندوں والی کون سی بات اس میں رہ گئی تھی۔ پرندوں کو ہم پنجروں اور کابکوں میں بند کر کے اپنے سانچے میں ایسا ڈھالتے ہیں کہ پھر وہ بیچارے پرندے ہی نہیں رہتے۔ جب ہی تو طوطے پنجرے سے نکل بھاگنے والے طوطے کو اپنی ڈار میں شامل نہیں ہونے دیتے۔ مانس گند، مانس گند، اسے چونچیں مار مار کے گھائل کر دیتے ہیں۔ لو میں بہک کر کدھر نکل گیا۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں، وہ جو کبھی کبھار صبح ہی صبح طوطوں کی ڈار چہکتی شور مچاتی تیزی سے بالا ہی بالا گذر جاتی تھی اس کا میری ترسی ہوئی نگاہیں اس وقت تک تعاقب کرتیں جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ ساتھ ہی اپنی محرومی اور اپنے امرود کی بیچارگی کا احساس ستانے لگتا۔ یہ امرودوں کی فصل تھی اور ہمارے آنگن

میں کھڑا پیڑ کچے پکے امرودوں سے لدا ہوا تھا مگر صرف گلہری کبھی کبھی امرودوں کو کترتی نظر آتی۔ طوطوں کی کسی ڈار نے اس کو ابھی تک نہیں نوازا تھا۔ اور وہ جو طوطوں کی ڈار بلندیوں پر پرواز کرتی نظر آتی ان کے متعلق تو میرا یہ گمان تھا کہ پستی میں کھڑا یہ درخت ان کی نظروں میں کیا سمائے گا۔ مگر ایک صبح عجب ہوا جب میں نہا دھو کر برآمدے میں آکر بیٹھا تو مجھے احساس ہوا کہ امرود کا پیڑ آج روز کی طرح ساکت اور خاموش نہیں ہے، جیسے اندر زندگی کی لہر دوڑی ہوئی ہے۔ میں متجسس اس کے قریب گیا۔ ایک دم سے شاخوں کے بیچ سے بہت سے طوطے بھرا کھا کے اڑے اور شور مچاتے یہ جاوہ جا۔ میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ خوش بھی ہوا اور تھوڑا افسردہ بھی۔ خوش یہ سوچ کر کہ ہمارے امرود کو بھی بالآخر شرف قبولیت حاصل ہو گیا۔ امرود کا پیڑ تو اس وقت ہی امرود کا پیڑ مانا جائے گا جب طوطے اس کے وجود کو تسلیم کر لیں۔ افسردہ یہ دیکھ کر ہوا کہ کترے ہوئے کچے پکے امرودوں کا ایک فرش پیڑ تلے بچھا ہوا تھا۔ دم کے دم میں وہ کتنا کچھ برباد کر گئے تھے۔ شرف قبولیت کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

ارے ہاں سل کھٹیا کو تو میں بھولا ہی جا رہا تھا۔ اچھا ہمارے یہاں تو اسے سل کھٹیا ہی کہا جاتا تھا۔ ویسے وہ کھٹ بڑھئی ہے یا کٹھ پھوڑا ہے۔ اگر ہُدہُد کہیں تو اس کا مرتبہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ حضرت سلیمان اور ملکہ بلقیس کا حوالہ دینا لازم آجاتا ہے۔ مگر میں اتنا اونچا اڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو اس ننھی سی برادری کا ذکر کر رہا ہوں جو ایک وقت میں ہمارے آنگن میں جمع ہو گئی تھی۔ مگر سل کھٹیا کو اس برادری سے جیسے نفور ہو۔ ایسے وقت میں آکر اترتی تھی جب چڑیاں بلبلیں، گرسلیں، گلہری سب چگ کر تتر بتر ہو چکی ہوتیں۔ دوپہر کو میں کبھی برآمدے میں آنکلتا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سل کھٹیا اکیلی چہل قدمی کر رہی ہے۔ مجھے دیکھا اور پُھر سے اڑ گئی۔ لگتا تھا کہ اسے خلوت کچھ زیادہ ہی پسند

ہے۔ اتنی کہ کبھی جوڑے کے ساتھ نظر نہیں آئی۔ بس جب بھی دکھائی دی اکیلی ہی دکھائی دی۔

تو یہ تھی وہ چھوٹی سی برادری جو ایک وقت میں اس آنگن میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ چاہیں تو آپ اسے لان کہہ لیں۔ میں نے یہاں ایک کیاری بنائی تھی جس میں کچھ پھول پودے لگا لئے تھے۔ باقی ڈھاکہ والی گھاس بچھادی تھی۔ اور امرود کا درخت تو خیر تھا ہی۔ تھوڑا کھانے دانے کا بھی میں نے انتظام کر دیا تھا۔ ایک کونڈا پانی کا۔ ارے پرندوں کو اور کیا چاہیے۔ اور چڑیاں تو ایسی ہل گئی تھیں کہ ہر پھر کر یہیں آجاتی تھیں۔ دانہ دنکا نہ بھی ہوتا تو یہاں چیں میں کرتی رہتیں۔ ویسے اپنے لیے تھوڑا رزق تو وہ گھاس کے بیچ کرید کر بھی برآمد کر لیتی تھیں۔ باقی پرندوں کا یہ تھا کہ دن کی جس گھڑی میں بھی انہیں پیاس لگتی دور سے اڑ کر یہاں آن اترتے۔ دو گھونٹ پانی پیا اور پھر اڑ گئے۔

مگر آسمان کو زمین پر زیادہ چہل پہل اچھی نہیں لگتی۔ ویسے سچ پوچھو تو آسمان مفت میں بدنام ہے۔ زمین پر جو بھی فساد برپا ہوتا ہے وہ زیادہ تر خود زمین والے ہی کھڑا کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ارباب شہر کو اچانک خیال آیا کہ آبادی بڑھ گئی ہے اور سڑکوں پر ٹریفک بہت ہو گیا ہے۔ سو سڑکیں چوڑی ہونی چاہئیں جو سڑکیں تنگ نظر آئیں اور وسعت کی طالب دکھائی دیں' ان میں ہماری سڑک بھی تھی۔ لیجئے بل ڈوزر آن پہنچے۔ بہت سے مزدور پھاوڑوں 'کلہاڑیوں' آروں سے مسلح ایسے آئے جیسے انہیں اس علاقہ پر چڑھائی کرنی ہے۔ درخت کٹنے لگے۔ سڑک ادھڑنے لگی۔ دن بھر پھاوڑا بجتا' کلہاڑیاں چلتیں' اونچے گھنے درخت دم کے دم میں زمین بوس ہو گئے۔ ایک یہاں گرا' دوسرا وہاں گرا۔ درختوں کے گرنے کا شور الگ کلہاڑیوں اور پھاوڑوں کے چلنے کا شور الگ۔ اوپر سے گرد کا طوفان۔ اس قیامت میں کتنے پرندے گھر سے بے گھر ہو گئے۔

درخت ایک گرتا تھا، اس کے ساتھ کتنے آشیانے اجڑتے تھے۔ پرندے شور مچاتے ہوئے اڑتے تھے، کچھ دیر اسی علاقہ میں حواس باختہ چکر لگاتے رہتے۔ پھر دور نکل جاتے۔ اس صورت اس علاقہ سے پرندوں کی ہجرت شروع ہو گئی۔

ہمارا آنگن اس قیامت کے اثرات سے کب تک محفوظ رہتا۔ گرد اڑاڑ کر یہاں بھی آتی تھی۔ ساتھ میں شور بھی۔ ہمارا جو چھوٹا سا سبزہ زار تھا وہ اچھا خاصا ریگ زار بن گیا۔ بلبلیں، گرسلیں، گلہری سب پریشان کہ یہ کیسا آشوب ہے۔ فاختائیں الگ خفا، مگر گلہری سب سے نازک مزاج نکلی۔ سب سے پہلے یہاں سے اسی نے کنارہ کیا۔ بلبلیں کچھ دن حواس باختہ نظر آئیں۔ پھر وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ فاختہ کا جو جوڑا یہاں وقت بے وقت آن اترتا تھا وہ بھی غائب غلہ ہو گیا۔ سل کھٹیا تو پابندی سے آتی ہی نہیں تھی۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کب آنا موقوف کیا۔

چڑیوں نے البتہ خاصی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ کافی دنوں تک اسی اپنے پرانے دستور کے مطابق چیں میں کرتی آتیں، ریزے چگتیں، پانی کے کونڈے پر تھوڑی دیر منڈلاتیں۔ پھر اڑ جاتیں۔ چڑیوں میں ایسے معاملات میں صبر کا مادہ اس لیے بھی زیادہ ہے کہ وہ تو رہتی ہی ہیں آدمیوں کے درمیان۔ ان کے اچھے برے جو بھی کام ہوتے ہیں وہ ان کی عادی ہو گئی ہیں۔ مگر صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ سڑکوں کی تعمیر کا کام ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ درخت سارے کٹ چکے تھے۔ پھاوڑا رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گرد کے بادل دبیز ہوتے چلے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ اب چڑیاں بھی صبر کا دامن چھوڑ رہی ہیں۔ اب وہ بہت بے چین نظر آتی تھیں۔ ان کی چیں میں میں جو ایک لہک ہوا کرتی تھی، وہ اب غائب تھی۔ تعداد بھی ان کی کم ہو گئی تھی۔ پانی کے کونڈے پر بھی اب وہ زیادہ دیر نہیں ٹکتی تھیں۔ اشنان تو کم و بیش موقوف ہی تھا۔ آئیں، ریزے چگے، گھونٹ بھر پانی پیا اور اڑ گئیں۔ پھر دن بھر نظر نہیں

آتی تھیں۔

کیسی شاد آباد صحبت تھی اور کس طرح برہم ہوئی۔ صبح اب یہاں خاموش گذرتی تھی۔ چہک مہک غائب 'بلبل کے تو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ لگتا تھا کہ اس علاقے کے سارے پرندے ہجرت کر گئے ہیں۔ جہاں وہ سب گئے وہاں اس آنگن میں اترنے والے پرندے بھی چلے گئے۔

سڑک کی تعمیر کا معاملہ اس شہر میں ہمیشہ سے یہی رہا۔ کام شروع تو ہو جاتا ہے ختم مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ اب کے بھی یہی ہوا۔ تعمیر کا کام لمبا ہی ہوتا چلا گیا۔ یااللہ یہ سڑک آخر کب بن چکے گی۔ کیا ہمارے آنگن سے جب آخری چڑیا بھی رخصت ہو جائے گی 'اس وقت بن کر تیار ہو گی۔ کیا واقعی اس سڑک کو آخری چڑیا کی رخصتی کا انتظار ہے اور واقعی یہی ہوا۔ تعمیر کے آخر دنوں میں سچ مچ یوں لگتا تھا کہ اس نواح سے پرندے ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے ہیں۔ اب تو کسی منڈیر سے کوے کی بھی کائیں کائیں سنائی نہیں دیتی تھی اور ہمارا آنگن یالان جو کچھ بھی کہو بالکل ویران ہو چکا تھا۔

سڑک کی تعمیر کا کام خدا خدا کر کے تکمیل کو پہنچا۔ جب میں نے باہر نکل کر سڑک پر نظر ڈالی تو پہلے تو میں واقعی دنگ رہ گیا۔ کتنی وسیع و عریض سڑک تھی۔ واقعی جدید عہد کی شاہراہ۔ پھر میں نے دائیں بائیں نظر ڈالی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ دور دور تک کوئی درخت نظر نہیں آیا۔ کھمبے ہی کھمبے۔ یہ سڑک اب درختوں سے خالی اور کھمبوں سے معمور تھی۔

چڑیوں کی آمد اب یکسر موقوف تھی۔ پھر بھی کونڈے میں پانی بھرا رکھتا تھا۔ کیا جانے کب کوئی پیاسی چڑیا یہاں اتر آئے۔ اسے یہاں سے پیاسا تو واپس نہیں جانا چاہیے۔ اور واقعی سڑک بننے کے بعد مجھے لمبا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک صبح کیا

دیکھتا ہوں کہ ایک چڑیا پھرر پھرر کرتی آئی اور کونڈے کے کنارے پر بیٹھ کر چونچ کو پانی میں ڈبویا۔ پانی پیا اور اڑ گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے طے کر لیا کہ یہ چڑیا آج آئی ہے تو اب کل بھی آئے گی اور اکیلی نہیں آئے گی، یہی ہوا۔ وہ تو بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ بس پھر چڑیاں آتی ہی چلی گئیں۔

پھر ایک صبح بلبلوں کا ایک جوڑا نمودار ہوا اور چڑیوں کے ساتھ چگنے میں شامل ہو گیا اور زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ امرود کی شاخ پر دو گڑ سلیں بیٹھی نظر آئیں۔ پوری طرح جائزہ لینے کے بعد پہلے ایک گڑ سل نیچے اتری اور توس کے ریزے چگنے میں شامل ہو گئی۔ اسے دیکھ کر دوسری گڑ سل نے ہمت پکڑی۔ وہ بھی نیچے اتر آئی۔

اب میں کتنا خوش تھا۔ سب پرندے ایک ایک کر کے واپس آ گئے۔ ایک نہیں آئی تو گلہری نہیں آئی۔ اور سل کھٹیا کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اب تو یہ لگتا ہے کہ وہ ماضی قدیم کی کسی منڈیر سے یا شاید حضرت سلیمان کے محل کی فصیل سے اڑ کر آئی تھی۔ وہیں واپس چلی گئی۔ اور گلہری...... ؟ شاید وہ بھی کہیں دور ہی سے آئی تھی۔ شاید لنکا کے پل کی تعمیر کے کام سے تھک کر ادھر نکل آئی تھی۔ وہیں واپس چلی گئی ہو گی۔

اللہ میاں کی شہزادی

پنن منہ اندھیرے ہڑبڑا کر آنکھیں ملتا اٹھا اور چلا ڈیوڑھی کی طرف۔ کچھ دنوں سے اسے صبح کی سیر کا لپکا پڑ گیا تھا مگر امی جان کے حساب سے یہ آوارگی تھی۔ ''ارے اس لڑکے کے لچھن اچھے نہیں ہیں۔ پڑھنا نہ لکھنا' آوارہ لونڈوں کے ساتھ ڈنڈے بجاتا پھرتا ہے۔ نیا وطیرہ یہ پکڑا ہے کہ ادھر صبح ہوئی اور گھر سے نکل گیا۔''اس وقت جانماز پہ بیٹھی تھیں۔ نماز پڑھ چکی تھیں۔ تسبیح بھی پھیر لی تھی۔ آخر میں دعا سے پہلے جو ایک مصرعہ کا ورد کیا کرتی تھیں وہ کر رہی تھیں۔

یا علی یا ایلیا یا ابوالحسن یا بوتراب

پنن کو جاتے دیکھا تو ورد کرتے کرتے رکیں اور بولیں ''یا علی یا ایلیا...... ارے بخت مارے' مینہ بوندی میں بھی چین نہیں ہے۔ رات اتنا مینہ پڑا ہے۔ رستوں میں کیچڑ پانی ہوگا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے باہر جانے کی۔''

مگر پنن کہاں سننے والا تھا۔ ایک کان سنا' دوسرے کان اڑایا اور تیر کے موافق ڈیوڑھی کو ناکھتا باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر اسے اعتبار آیا کہ رات واقعی بہت مینہ پڑا ہے۔ جا بجا پانی کے تھالے بیچ بیچ میں کیچڑ' مگر گلی کے نکڑ پہ جو املی کھڑی تھی وہ دھل دھلا کر

کیسی ہری بھری ہو گئی تھی۔ اور پھننگ پہ بیٹھا کوا کتنے مزے میں کائیں کائیں کر رہا تھا۔ بس اسی گھڑی ایک غلہ اس کے بالکل برابر ٹہنی میں آکر لگا۔ نشانہ چوک گیا اور کوا اڑ کر یہ جا وہ جا۔ یہ بندو تھا۔ غلیل لے کر صبح ہی صبح گھر سے نکل پڑا تھا۔

"بندو تو؟" پنن اسے دیکھ کے کتنا خوش ہوا۔

"جنگل چلیں؟" بندو نے فوراً تجویز پیش کی۔

"چلو چلیں۔" پنن نے بلا تامل ہاں میں ہاں ملائی اور فوراً ہی جنگل کی طرف ہو لیے۔

جنگل کون سا، بس یہی کہ بستی سے نکل کر جہاں تہاں درختوں کے جھنڈ، بیچ بیچ میں اونچی اونچی گھاس، اِکّادُکّا کھیت، کوئی چھوٹا موٹا باغ جسے سب بغیا کہتے تھے، بس یہی ان کے حساب سے جنگل تھا۔

"یار کوئی ہریل مل جاوے تو مزہ آجاوے۔" بندو نے غلیل کو ہاتھ میں تولتے تولتے کہا۔ ہریل تو کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ہاں ایک نیل کنٹھ ٹیلی گراف کے لمبے کھنچے ہوئے تار پہ جھولتا نظر آیا۔ فوراً ہی اس نے غلیل کھینچی اور غلہ داغ دیا۔ پھر نشانہ چوک گیا۔ نیل کنٹھ نے پھریری لی اور فضا میں اوپر اٹھ کر دور تک تیرتا چلا گیا۔

آگے چامنڈا کے مندر کے پاس کھڑے پیپل کی ٹہنیوں میں بندر جھول رہے تھے۔ بس فوراً ہی بندو نے غلیل تانی اور پنن نے ایک بڑا سا کنکر اٹھایا اور بندروں پر ہلہ بول دیا۔ بندروں میں کھلبلی پڑ گئی۔ کتنی بندریاں اپنے اپنے بچوں کو چھاتی کے ساتھ لگائے چیں چیں کرتی تیزی سے گدے پھلانگتی اوپر کی ٹہنیوں میں جا چھپیں مگر ایک بندر نے دلیری دکھائی اور خم ٹھونک کر خوخو کرتا ہوا نیچے تنے تک اتر آیا۔ یہ دیکھ کے بندو اور پنن دونوں ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔

آگے دور تک گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ دونوں

کے پائینچے پانی میں تربتر ہو گئے۔ رات بارش جو بہت ہوئی تھی۔ ساری گھاس بھیگی ہوئی تھی۔ "ارے ٹڈا۔" بندو لپک کر بولا۔ اسے ایک آنکھ پھوڑ ٹڈا گھاس میں بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ اتنا ہرا تھا کہ پہلے تو گھاس میں اس کا پتہ بھی نہ چلا۔ جیسے وہ بھی گھاس کی لمبی سی پتی ہو۔ بندو نے اس کی مونچھوں سے اسے پہچانا۔ بس اسے پکڑنے کے لیے دوڑا مگر وہ پھر سے اڑ گیا۔ بندو نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ دوڑتے دوڑتے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ غور سے گھاس کو دیکھنے لگا۔ پھر چلّایا "ابے او پنن، ادھر آ۔"

"کیا ہے بے؟"

"بیر بہٹی۔"

"اچھا؟" پنن کے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کتنی تیزی سے وہ دوڑا۔

پنن تو دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ "اتنی بہت سی بیر بہٹیاں۔" واقعی، کتنی بہت سی تھیں وہ۔ سبز سبز گھاس پہ لال لال بوندیاں سی اور کتنی تیز تیز دوڑ رہی تھیں۔ پنن اور بندو کتنی دیر تک انہیں تکتے رہے۔ پھر پنن نے آہستہ سے ایک بیر بہٹی کو انگلی سے چھو لیا۔ چلتے چلتے وہ فوراً ہی ساکت ہو گئی۔

بندو نے اسے غصے سے دیکھا "تو نے اسے کیوں چھوا، مر گئی بیچاری۔"

"نہیں، مری نہیں ہے۔" پنن نے اعتماد سے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"مکر کر رہی ہے۔"

پنن نے صحیح کہا، اسے بیر بہٹیوں کے مکر کا خوب پتہ تھا۔ اس نے پچھلی برسات میں کتنی بیر بہٹیاں پکڑی تھیں اور شیشی میں پیلی مٹی ڈال کے انہیں اس کے اندر رکھا تھا۔ بیر بہٹی کو ذرا چھو لو، فوراً ہی دم سادھ لیتی ہے۔ بس یہ ظاہر کرتی ہے جیسے مر گئی ہو مگر پنن نے ایسا تصور باندھا تھا جیسے لال پری ہو اور روٹھ کر اٹوانٹی کھٹوانٹی لے

کے پڑ گئی ہو۔

پنن اور بندو دونوں نے جلدی جلدی جتنی بیر بہٹیاں چن سکتے تھے چن کر اپنی گود میں رکھ لیں اور واپس ہو لئے۔ اتنی دولت تو مل گئی تھی۔ اور آگے جا کر انہیں کیا ملنا تھا۔

پنن خوشی خوشی گھر واپس آیا۔ اس الماری میں سے جہاں اس کا بستہ رکھا تھا وہ شیشی نکالی جس میں تھوڑی پیلی مٹی پڑی تھی اور چار پانچ بیر بہٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اچانک کتنی بہت سی بیر بہٹیاں اسے مل گئی تھیں۔ کتنے شوق کے ساتھ وہ بیر بہٹیوں کو ایک ایک کر کے شیشی میں رکھنے لگا۔ اتنے میں وہاں عشو آ نکلی۔ بیر بہٹیوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ للچائی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ پھر التجا کے لہجہ میں بولی: ''ایک بیر بہٹی ہمیں دے دو۔''

''کیوں دے دوں؟''

''دے دو۔''

''نہیں۔''

عشو پنن کے جواب سے بہت مایوس ہوئی۔ تھوڑی دیر تک بیر بہٹیوں کو حسرت کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر مایوس ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ پنن نے اس کے جانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ اپنی بیر بہٹیوں کے ساتھ مگن تھا۔

تھوڑی دیر بعد عشو واپس آئی۔ اب وہ ایک نئے اعتماد کے ساتھ واپس آئی تھی۔ اس کے پتلے پتلے گورے گورے ہونٹوں کے بیچ ایک پیپیا تھا جس سے پیں پیں کی آواز نکل رہی تھی۔ اب پنن نے عشو کو رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ عشو نے پنن کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ پیپیا بجا رہی تھی اور خوش تھی۔

آخر پنن سے رہا نہ گیا۔ پیار بھرے لہجہ میں بولا: ''عشو، بیر بہٹی لے گی؟''

عشو نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا: ''نہیں، میں نہیں لیتی۔''

پٹن اس جواب پہ بہت سٹپٹایا۔ تھوڑی دیر چپ رہا جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اب کیا کہے خیر تھوڑی ہی دیر میں اسے ایک اور ترکیب سوجھ گئی۔ بولا: ''اچھا ایسا کرتے ہیں کہ میں تجھے بیر بہٹی دے دوں تو مجھے پپیا دے دے۔''

عشو سوچ میں پڑ گئی۔ آخر وہ اس سودے پر آمادہ ہو گئی۔ بھاؤ تھوڑا سا بڑھا دیا۔ ''دو لوں گی۔''

پٹن نے سوچا۔ پھر رضامند ہو گیا۔ اس نے جھٹ پٹ دو بیر بہٹیاں شیشی سے نکال کر عشو کی ہتھیلی پہ رکھ دیں۔ عشو نے پپیا اپنے ہونٹوں کے بیچ سے نکالا اور پٹن کو دے دیا۔ پٹن نے فوراً ہی اپنے ہونٹوں میں داب اسے بجانا شروع کر دیا۔ اب اس نے بیر بہٹیوں کی شیشی بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور پورے انہماک سے پپیا بجانے لگا۔ پٹن بہت دیر تک پپیا بجاتا رہا۔ مگر پھر وہ بجاتے بجاتے اس سے بور ہو گیا۔ اسے اب عشو کی تلاش ہوئی۔ خیر برابر ہی میں تو اس کا گھر تھا۔ وہ سیدھا اس کے گھر پہنچا اور بولا:

''عشو، اپنا پپیا لے لے ہماری بیر بہٹیاں ہمیں لوٹا دے۔''

''بھیا، اب تو ہم پپیا نہیں لیں گے۔ وہ جھوٹا ہو گیا۔''

''کیسے جھوٹا ہو گیا۔'' پٹن نے چڑ کر کہا۔

''اس میں تمہارا تھوک لگ گیا ہے۔''

اس پہ پٹن بہت جھینپا۔ واقعی پپئے میں اس کا تھوک تو لگ گیا تھا مگر پھر وہ دھاندلی پہ اتر آیا۔ کہنے لگا: ''تیرا بھی تو تھوک لگ گیا تھا اس پہ۔''

عشو نے فوراً ہی زبان نکال کر دکھا دی۔ ''دیکھ کہیں میری زبان پہ تھوک ہے۔''

پٹن کو عشو کی پتلی پتلی سرخ زبان بہت اچھی لگی۔ وہ دل میں قائل ہو گیا کہ واقعی عشو کی زبان تو اتنی اچھی ہے۔ اس پر ذرا سا بھی تھوک نہیں ہے۔ مگر پھر اس نے

دھاندلی کی "مچھو کے دیکھوں گا"

"دیکھ لے۔"

پنن نے انگلی لگا کے عشو کی زبان کو دیکھا۔ اس لمس میں اسے بہت مزہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنی انگلی اس کی زبان پہ اسی طرح رکھے رہے۔ اس نے انگلی کو زبان میں اور زیادہ پیوست کر دیا۔ اور پھر...... مگر اچانک ٹی وی شروع ہو گیا اور اتنی اونچی آواز میں کہ ساری یادیں تتر بتر ہو گئیں اور تصور کا جو تار بندھا تھا وہ کھٹ سے ٹوٹ گیا۔

ٹی وی نے ہمارے گھروں میں آکر عجیب کھنڈت ڈالی ہے۔ اب نہ ہم یکسوئی سے سوچ سکتے ہیں نہ اطمینان سے من میں یادوں کی دنیا آباد کر سکتے ہیں۔ میری بیگم نے جانے کون سا پروگرام سننے کے لیے یا کون سا سیریل دیکھنے کے لیے بیٹھے بیٹھے ٹی وی کے ریموٹ کا بٹن دبا دیا اور ٹی وی اتنی اونچی آواز سے شروع ہوا کہ یادوں کا سارا سلسلہ درہم و برہم ہو گیا۔ یادوں کا معاملہ بھی بیر بہٹیوں کا سا ہے۔ دل و دماغ میں موسم خوشگوار دیکھ کر جانے کون سی تہہ سے نکل کر سبھا سجا لیتی ہیں۔ مگر ایک ذرا سے کھٹکے سے ساری سبھا پہ مردنی چھا جاتی ہے۔ وہ ایک بھولی بسری صبح جو خوشگوار یادوں کے جلو میں میرے تصور میں آکر جگمگائی تھی وہ ایک دم سے ماند پڑ گئی۔ جیسے اس میں سے ساری جان نکل گئی ہو۔ اب میں حیران ہو کر سوچ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ ہوا کیا۔ کہاں سے کس کھوہ سے نکل کر اس صبح نے مجھے درشن دیئے۔ پھر ایکا ایکی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور یہ صبح اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی۔ ویسے تو اکثر میرے ساتھ یہ ہوا ہے کہ بیتے ہوئے صبح و شام میں سے کوئی بھولی بسری شام کوئی پچھلا پہر، کوئی دوپہر اچانک دھیان میں آ گیا اور پھر پورے تصور پر چھا گیا مگر ان میں سے ہر پچھلے پہر، ہر دوپہر کا مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے آگے پیچھے کیا تھا اور یہ کہ حافظہ سے یہ ساعت یکسر محو نہیں ہوئی تھی۔ بس کہیں حافظہ کے عقب کے گوشے میں جا پڑی تھی مگر اس صبح کے تو میری

صبحوں کے بیچ دور دور تک کہیں اثر آثار نہیں تھے۔ جانے میری صبحوں کے انبار تلے کہاں دبی پڑی تھی اور اب میرے دھیان میں آئی ہے تو حیران ہو رہا ہوں کہ میری ساری صبحوں میں یہی تو ایک سچی صبح تھی جیسے میں سارا کا سارا اس ایک صبح میں سمایا ہوا ہوں۔ پھر میں اسے بھولا ہوا کیوں تھا اور ہاں پنن۔ جیسے یہ بھی اس صبح کے ساتھ گم ہو گیا ہو۔ پنن کون تھا۔ میں؟ میں تو وہ ہوں جو اب ہوں۔ اب پنن دھیان میں آیا ہے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کون سا وجود تھا مگر اب تو مجھے سب ہی اجنبی نظر آتے ہیں۔ بیر بہٹی، پپیا، اور ہاں عشو۔ سب ایسے غائب ہوئے کہ پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑا۔ برسات تو اب بھی ہوتی ہے۔ گھاس بھی اگتی ہے۔ آم بھی پکتے ہیں۔ ان کی گٹھلیاں بھی ہوتی ہیں مگر گٹھلی گٹھلی ہی رہتی ہے۔ پپیا نہیں بنتی۔ نہ اب کسی گھاس کے تختے پہ بیر بہٹی اپنے ننھے منے پنجوں کے ساتھ رینگتی دوڑتی نظر آتی ہے۔ ارے سب کہاں گئے۔

خیر بیر بہٹی تو ان دنوں بھی بس برسات کی صبحوں میں گھاس کے بیچ گھڑی دو گھڑی کے لیے درشن دیتی تھی۔ پھر گھونگھٹ کر لیتی تھی۔ پھر پنن ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ اس گھاس میں دیکھ اس گھاس میں دیکھ۔ کہیں جو دکھائی دے جائے۔ پھر اسے تجسّس ہوتا کہ آخر یہ بیر بہٹی جن ہے پری ہے، ایسے کیوں غائب ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں حیرتیں لیے وہ بڑی اماں کے پاس پہنچا۔ جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو بڑی اماں ہی سے جا کے پوچھتا تھا۔ امی جان اس کے ایسے سوالوں کا کہاں جواب دیتی تھیں۔ بس اسے ڈانٹتی پھٹکارتی رہتی تھیں مگر بڑی اماں کا سلوک بالکل مختلف تھا۔ کیسی سنجیدگی سے اس کی اول ٹپال باتیں سنتی تھیں اور کیسی رسانیت سے اسے سمجھاتی تھیں کہ وہ بالکل مطمئن ہو جاتا تھا۔ بیر بہٹی کے بارے میں اس کا تجسّس دیکھ کر اسے بتایا کہ "بیٹا، بیر بہٹی اللہ میاں کی شہزادی ہے۔"

"اچھا، بیر بہٹی اللہ میاں کی شہزادی ہے۔" پنن بہت حیران ہوا۔ سوچتا رہا پھر

پوچھنے لگا: "اللہ میاں کی شہزادی ہے تو یاں کیا لینے آتی ہے۔ یاں تو اسے گھاس ہی ملتی ہے۔"

"بس اسے برکھا اچھی لگتی ہے تو ساون بھادوں میں سیر کے لیے یاں آجاتی ہے۔ برسات ختم ہو جاتی ہے تو وہ بھی چلی جاتی ہے۔"

"کہاں چلی جاتی ہے۔"

"ارے ویسے تو اسے واپس اللہ میاں کے گھر ہی جانا چاہیے مگر شہزادیوں کا کیا اعتبار۔ سیل سپاٹے کے شوق میں کہیں بھی نکل جاویں۔ جیسے پھول شہزادی تھی۔ آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے ایک پھول میں جا چھپی۔ وہ جگہ اسے ایسی بھائی کہ وہیں رہ پڑی۔ وہ تو سوداگر زادے کا خدا بھلا کرے، اس نے اسے وہاں سے نکالا۔"

پھول شہزادی کون تھی۔ سوداگر زادہ کون تھا۔ شہزادی کو اس نے پھول کی قید سے کیسے نکالا۔ پنّن نے اتنے سوال کر ڈالے کہ بڑی اماں کو پھر وہ کہانی سنانی ہی پڑی۔ "اے بیٹا، وہ بغداد کا سوداگر زادہ تھا۔ مال واسباب بیچنے کے لیے سفر پہ نکلا ہوا تھا۔ ملک ملک نگر نگر کا سفر کرتا کراتا کہیں سراندیپ میں جا نکلا۔ وہاں کیا دیکھا کہ خلقت کسی پھول کا ذکر کرتی ہے اور حیران ہوتی ہے۔ وہ ٹوہ لینے لگا کہ کیسا وہ پھول ہے اور کیا اس کی کہانی ہے۔ بتانے والوں نے بتایا کہ عجب ماجرا ہے۔ ہمارے نگر کے بیچ ایک بڑا کنواں ہے۔ کچھ دنوں سے اس میں ایک پھول کھلا ہے۔ دور سے دیکھو تو لگے ہے کہ کنویں میں پانی منھا منھ بھرا چھلک رہا ہے اور پھول اس پہ تیر رہا ہے۔ کنویں کے پاس جاؤ تو پانی پھول سمیت نیچے تہہ میں چلا جاتا ہے۔ جیالوں نے کنوئیں میں اتر کر بھی دیکھ لیا، پانی اور نیچے اتر گیا۔ پھول جل دے گیا۔

سوداگر زادے پہ جو سنک سوار ہوئی تو وہ کنوئیں کی طرف ہو لیا۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ دیکھا کہ کنواں منھا منھ بھرا ہے۔ پانی چھلک چھلک کے من پہ بہہ رہا ہے اور ایک لال ڈھڈھا پھول پانی پہ تیر رہا ہے۔ وہ قدم مار تا کنوئیں کے پاس پہنچا اور کیسی عجیب

بات ہوئی کہ اب کے نہ پانی تہہ میں گیا نہ پھول نے جل دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور پھول اٹھالیا۔ خلقت حیران کہ یہ اجنبی کون ہے۔ کدھر سے آیا اور کس آسانی سے پھول اچک کر لے گیا۔"

خلقت سے زیادہ پنن حیران تھا کہ یہ کیسا پھول تھا۔ کیا اس میں بھید تھا۔ بڑی اماں چپ ہوئیں تو بے چین ہو کر بولا: "بڑی اماں، پھر کیا ہوا۔"

بڑی اماں نے سروطے سے چھالیا کترتے کترتے تھوڑی سی منہ میں ڈالی اور بولیں: "ارے بیٹا کیا بتاؤں کیا ہوا۔ سوداگر الٹے پیروں خوش خوش اپنی سرائے میں گیا۔ اپنی کوٹھڑی میں جا کے پھول کو طاق میں رکھ دیا اور پھر اطمینان سے دوشالہ تان کے سو گیا۔ صبح کو جو اٹھا تو کیا دیکھا کہ دوشالہ بدلا ہوا ہے جو اوڑھ کر سویا تھا وہ کاسنی رنگ کا تھا، یہ عنابی ہے اور پھولوں میں بسا ہوا کہ دماغ اس کا معطر ہو گیا۔ بہت حیران ہوا۔ اسی حیرانی میں دن گذر گیا۔ رات کو وہی عنابی دوشالہ اوپر لے کر سو گیا۔ اب جو صبح کو اٹھا تو ایک نئی حیرانی نے اسے آلیا تعجب سے اپنی انگلی کو دیکھتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ تو میری انگوٹھی نہیں ہے، میری انگوٹھی کون لے گیا۔ ایسی خوبصورت انگوٹھی اس کی جگہ کون پہنا گیا۔ تو پھر اسی حیرانی میں دن گذرا۔ رات کو دیر تک جاگا کیا۔ مگر نیند تو سولی پہ بھی آ جاتی ہے۔ تو اسے رات کے کسی پہر میں نیند آ گئی۔ اب کے صبح کو اٹھا تو دیکھا کہ اس کی جوتی بدل گئی ہے۔ حیران کہ میری جوتی کون لے گیا۔ اتنی خوبصورت اتنی نازک جوتی یہاں اس کی جگہ کون رکھ گیا۔ سارا دن اسی شش و پنج میں رہا۔ رات سونے کا سمے آیا تو اسے ایک ترکیب سوجھی چاقو لے کر کانی انگلی میں اس زور سے مارا کہ انگلی میں زخم پڑ گیا۔ زخم میں مرچیں کوٹ کے بھر لیں۔ اور لیٹ گیا مگر اب نیند کہاں آنی تھی۔ زخم کی تکلیف بھلا سونے دیتی تھی۔ جاگتا رہا، جاگتا رہا کہیں پچھلے پہر میں اسے لگا کہ کوٹھڑی میں اجالا ہونے لگا ہے۔ طاق پہ نظر گئی دیکھا کہ پھول میں لرزش ہے اور روشنی سے دمک رہا ہے۔

پھر دیکھا کہ پھول جو پہلے ہی کھلا ہوا تھا اور کھل اٹھا۔ بیچ میں سے ایک سایہ نکلا۔ سایہ کہاں 'ایک نازک 'پدمنی 'گوری رنگت 'چاندنی سی مورت 'آنکھوں میں گلابی ڈورے 'ہونٹ جیسے گلاب کی دو پنکھڑیاں 'گردن صراحی دار 'بوٹا سا قد 'چھریرا بدن 'اے بھیا 'سوداگر تو لہلوٹ ہو گیا۔"

بڑی اماں دم لینے کے لیے رُکیں۔ پتن کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے۔

"بڑی اماں 'پھر کیا ہوا۔"

بڑی اماں نے بٹوے سے چٹکی بھر تمباکو نکال کر منہ میں رکھا اور بولیں:

"ارے بیٹا پھر کیا ہونا تھا۔ چور پکڑا گیا۔ وہ دھیرے دھیرے سوداگر زادے کے پلنگ کے پاس آئی۔ شہزادے نے ایسا مکر بھرا جیسے گہری نیند سو رہا ہے۔ وہ اس کا گلوبند بدلنے لگی تھی کہ اس نے اس کا پہنچا پکڑ لیا۔ اس نے چھڑانا چاہا۔ اس نے نہ چھوڑا۔ "پہلے یہ بتا کہ تو کون ہے 'جن ہے یا پری ہے۔"

وہ روہانسی ہو کر بولی: "اے اجنبی 'میں نہ جن ہوں نہ پری ہوں۔ اس دیس کی دکھیاری شہزادی ہوں۔ میں تو اپنے باغ میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ پکڑے جانے کے دھڑکے سے پھلواری میں گھس گئی اور ایک نئے نئے کھلے پھول کے پردے میں چھپ گئی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ نگوڑا پھول مجھ پہ ایسا رتجھے گا کہ چم چچڑ ہو جاوے گا......"

"ارے سن رہے ہو کیا خبر آئی ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی ٹی وی کی آواز اونچی ہو گئی۔

یادیں پھر تتر بتر ہو گئیں۔ تصور کا تار پھر ٹوٹ گیا۔ اتنی تیزی سے اس خوبصورت دنیا سے جہاں میں مگن تھا اس بس بھری دنیا میں آیا کہ چند لمحوں تک تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ ہوا کیا۔ میں کہاں تھا اور کہاں آ گیا۔ جب سمجھ میں آیا تو بہت کوفت

ہوئی اور جھنجلاہٹ بھی۔ اسی کوفت اور جھنجلاہٹ میں پوچھا "کیا خبر آئی ہے۔ کوئی قیامت آگئی؟"

"اے ہے سن تو لو۔"

"سناؤ۔"

"ہندوستان نے اپنے سفیر کو واپس بلالیا۔ سمجھوتہ ایکسپریس بند ہو رہی ہے اور بس بھی۔"

"اور؟"

"ابھی تک تو اتنا ہی ہوا ہے۔ اور تم تو دلی جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اب کیا کروگے؟"

"اور کیا کرنا ہے۔ نہیں جاؤں گا۔"

"اجی تم نے تو آسانی سے کہہ دیا کہ نہیں جاؤں گا۔" اب بیگم کا لہجہ بھی تیز ہو چلا تھا "مگر بتول خالہ کیا کریں گی۔ کم بختوں نے ویزا دینے میں اتنے دن لگادیئے۔ ارے چلی گئی ہوتیں تو مرتی ہوئی بہن کی آخر وقت میں صورت تو دیکھ لیتیں۔ بچاری بتول خالہ۔"

"بچاری بتول خالہ" میں نے اپنے جھنجلائے ہوئے لہجہ میں بیگم کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔ "ایک وہی بچاری ہیں' اور جو اتنے بیچارے......" اتنی جھنجلاہٹ تھی کہ میں فقرہ بھی پورا نہ کر سکا۔

"اے ہے تم تو کاٹ کھانے کو دوڑ رہے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے۔ ان سے جا کے لڑو جو کر رہے ہیں۔"

میری ساری جھنجلاہٹ سارا غصہ ایک دم سے بیچارگی کے احساس میں بدل گیا۔ بس میں بھی بچاری بتول خالہ بن گیا۔ "ہاں جو کر رہے ہیں بھلا میں ان سے لڑ سکتا

ہوں۔" اور میں نے ریموٹ کا بٹن دبایا۔ ایک دم سے ٹی وی خاموش ہو گیا۔ اس بیچارگی میں بس اتنا ہی کچھ کر سکتا تھا۔

بیگم نے غصے سے میری طرف دیکھا "پوری خبریں تو سن لینے دیتے۔"

"جو خبر سن لی وہ کافی نہیں ہے۔" میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر اپنے بستر میں جا لیٹا۔ دل ہی دل میں سب پہ لعنت بھیجی۔ اس پورے زمانے پر۔ دھیان ادھر سے ہٹا کر پھر ادھر ہی لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ بیر بہٹی' پپیا' عشو' اس کی پتلی پتلی نرم سی زبان' بڑی اماں' پھول شہزادی' سوداگر زادہ' سلسلہ جوڑنے کی بہت کوشش کی۔ تصور میں سلسلہ جڑ ہی نہیں پا رہا تھا۔ بہت مشکل سے جڑ جڑ کر ایک تصویر تصور میں ابھری۔

"پنن ہمارا پپیا ہمیں دے دو۔ اور اپنی بیر بہٹیں لے لو۔"

"کیوں اب کیا ہوا؟"

"وہ مر گئیں۔"

"کیسے؟"

"مجھے کیا پتہ' بس مر گئیں۔"

"تو نے انہیں چھوا ہو گا۔"

"نہیں اللہ قسم میں نے بالکل نہیں چھوا' بس ذرا انگلی لگائی تھی۔ بس مر گئیں۔"

دونوں کا منہ لٹک گیا۔

اور پھول شہزادی کا کیا ہوا۔ اس نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی کہ کہانی آگے کیسے چلی تھی۔ سلسلہ جو ٹوٹ گیا تھا وہ جڑ ہی نہیں پایا۔

جبالا کا پوت

یہ جبالا کے پوت کی کہانی ہے جو ماں سے سوال بہت کرتا تھا۔ اصل میں وہ بھی اپنشدوں کے نرالے بالکوں میں سے تھا جو ماں کے پیٹ سے سوال کرتے ہوئے پیدا ہوتے تھے بلکہ کوئی کوئی تو پیٹ میں لیٹے لیٹے ہی سوال کرنا شروع کر دیتا تھا۔ جبالا نے پوت کے روز روز کے سوالوں سے تنگ آ کے کہا کہ میرے لال میں تیری ماں ہوں، کوئی ودھوان نہیں ہوں۔ اگر تجھے جاننے پوچھنے کی ایسی ہی چینک ہے جا کے لومارشی کی چوکھٹ پہ ماتھا ٹیک۔ وہ ساری ویدوں کو گھول کے پیئے بیٹھے ہیں۔ اگر انہوں نے دیا کی تو تو گیانی بن جائے گا۔ پھر میں بھی تیری طرف سے نچنت ہو جاؤں گی۔

جبالا کے پوت نے ماں کے کہے پر عمل کیا اور جا کے لومارشی کے چرن چھوئے۔ لومارشی نے اسے غور سے دیکھا۔ پوچھا۔ ''پتر، تو یاں کیا لینے آیا ہے۔''

جبالا کے پوت نے ہاتھ جوڑ کے کہا: ''مہاراج، گیان کی مایا۔''

بولے۔ ''گیان کی مایا مانگے سے نہیں ملا کرتی۔''

اس نے پھر ہاتھ جوڑے اور کہا: ''چرنوں میں بیٹھنے کی آ گیا مل جاوے تو کسی شبھ گھڑی میں مل ہی جاوے گی۔''

لومارشی تھوڑے نرم پڑے۔ ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھا۔ پوچھا:

"تو کس کا پوت ہے۔"

بولا: "جبالا کا۔"

"جبالا کا۔ اچھا۔ پر میں پوچھ رہا ہوں کہ تیرا پتا کون ہے۔"

"مہاراج، اس کا تو مجھے پتا نہیں۔"

اس پر رشی جی نے کہا۔ "مورکھ پوت اپنے پتا سے پہچانا جاتا ہے جس کی اس پہچان میں کھوٹ ہے اسے اس آشرم میں ٹکنے کی جگہ نہیں مل سکتی۔ جا، اپنی میا سے پوچھ کے آ کہ تیرا پتا کون ہے؟"

جبالا کا بیٹا جبالا کے پاس واپس گیا۔ بولا: "میا، رشی جی پوچھتے ہیں کہ پتا تیرا کون ہے؟ کہتے ہیں کہ یہ جانے بنا میں تجھے اپنا شش نہیں بناؤں گا۔ تو ماں، میرا پتا کون ہے اور کہاں ہے؟"

جبالا سوچ میں پڑ گئی۔ ادھر بیٹا بھی سوچ میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ میں نے ماں سے اتنے سوال کیے، اتنی باتیں پوچھیں، یہ پوچھنے کا کبھی خیال ہی نہ آیا کہ میرا پتا کون ہے؟ اور آخر وہ ہے کہاں؟ اس کی بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ آخر جبالا نے زبان کھولی۔ "میرے لال، یہ تب کی بات ہے جب میں راج محل کی دھوبن تھی۔ ان دنوں تو میں خود دھوبی گھاٹ بنی ہوئی تھی۔ راج کمار سے لے کے گھاٹ کے دھوبیوں تک اتنے مردوں سے ملی ہوں کہ اب کچھ یاد نہیں کہ ان میں تو کس کا بیج ہے۔ مگر میرے پوت، تو کان کھول کے سن لے اور جان لے کہ کونپل مٹی سے پھوٹتی ہے اور پیڑ، پودے اپنی دھرتی ہی سے پہچانے جاتے ہیں، بیج ڈالنے والے سے نہیں۔ ان موؤں کا کیا ہے۔ بیج ڈالا اور چلتے بنے۔ سو میرے پوت تو جان لے اور رشی کو بھی جا کے بتا دے کہ جبالا نے تجھے جنا ہے، سو جبالا ہی کا تو پوت ہے۔"

جبالا کا پوت یہ سن کر پھر رشی جی کے پاس گیا۔ چرن چھوئے' ڈنڈوت کی اور کہا۔ ''مہاراج' جن دنوں میری ماں کو گربھ رہا تھا' ان دنوں وہ راج محل کی دھوبن تھی۔ واں یہ راج پوت' پنڈت' نائی' دھوبی' چمار' ہر طرح کے مرد سے ملی۔ اب اسے بالکل یاد نہیں کہ میں ان میں سے کس کا بیج ہوں۔ پر میری ماں نے کہا اور میں نے جانا کہ کونپل مٹی سے پھوٹتی ہے اور پیڑ' پودے اپنی دھرتی سے پہچانے جاتے ہیں۔ بیج ڈالنے والوں کا کیا ہے۔ وہ تو بیج ڈال کے نچنت ہو جاتے ہیں۔ پیچھے مڑ کے بھی نہیں دیکھتے۔ سو پتا کو تو میں نہیں جانتا کہ وہ کون۔ پر جو جاننے کی بات ہے وہ جانتا ہوں کہ جبالا نے مجھے جنا ہے سو میں جبالا کا پتر ہوں۔''

لو مارشی نے دھیان سے اس کی بات سنی۔ سوچا۔ پھر بولے

''بالک' میں نے جان لیا کہ تو برہمن بچہ ہے۔ ایسی کھری بات اتنے کھرے پن سے کوئی برہمن بچہ ہی کر سکتا ہے۔ سو تو آج سے میرا ششں ہے۔ جو میں جانتا ہوں وہ تجھے بتاؤں گا۔ پر ایک شرط ہے۔ پہلے تو بھور بن میں جا کے بارہ برس تک میری گیوں کی دیکھ بھال کر۔ جب بارہ برس پورے ہو جائیں تو پھر تو واپس آ۔ پھر میں تجھے اپدیش دوں گا اور جو تو پوچھے گا وہ بتاؤں گا۔''

جبالا کے پوت نے رشی جی کے چرن چھوئے اور بھور بن کی طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر رشی جی کی گیوں' بیلوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ وہاں رہتے ہوئے بن کے جیو جنتوسے' پشو پکھیرو سے' رینگنے والے کیڑوں' دوڑنے والے چوپایوں سے اس کا یارانہ ہو گیا۔ بن کے سارے جانور اس کے متر تھے۔ وہ ان کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگا۔ دن' مہینے' برس' دو برس' تین برس' بس اسی طرح سے گذرتا چلا گیا۔ آخر کو بارہواں برس آ گیا۔ آیا اور آ کر چلا گیا۔ وہ بن کے باسیوں کے بیچ ایسا مگن تھا کہ برسوں کے آنے جانے کا اسے پتا ہی نہ چلا۔

ایک دن گیرں، بیلوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ کہنے لگے کہ لومارشی کے شش کو بارہ برس بیت گئے۔ پر وہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ پتا تو چلے کہ اس کی اچھا کیا ہے۔ خیر ویسے تو وہ بھلا مانس ہے۔ ہمارا اس نے کیا بگاڑا ہے۔ ہماری دیکھ بھال ہی کرتا رہا۔ ہم اس کا بدلہ اسی طرح دے سکتے ہیں کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں اسے بتادیں۔ شاید کوئی کام کی بات، اس کے پلے پڑ جائے۔

اس صلاح مشورے کے بعد گیوں، بیلوں نے دوسرے جانوروں کو بھی اپنے ساتھ ملایا اور پہنچے جبالا کے پوت کے پاس۔ کہا کہ "اے لومارشی کے شش، تیرے بارہ برس پورے ہو گئے۔ اب تو یہاں کیا لینے کے لیے رُکا ہوا ہے۔ آخر تو بستی کا رہنے والا ہے۔ اس بن میں کب تک بھٹکتا پھرے گا۔ تو نے ہماری بہت سیوا کی۔ ہم تو بس اتنی ہی سیوا کر سکتے ہیں کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ تجھے بتائیں اور عزت کے ساتھ تجھے رخصت کریں۔ سو آج کی رات بیل، سرشٹی کے وہ سارے بھید جو وہ جانتا ہے تجھے بتائے گا۔"

سو اس رات بیل جبالا کے پوت کے پاس رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے جیسے کوئی لمبی بات شروع ہونے لگی ہے۔ پر نہ جبالا کا بیٹا بولا، نہ بیل نے کوئی بات کی۔ تاروں کی چھاؤں میں درختوں کے بیچ دونوں چپ بیٹھے رہے۔ آخر کو رات گذری اور صبح ہوئی۔ تب بیل نے کہا: "اے جبالا کے بیٹے میں جو کچھ جانتا تھا وہ میں نے تجھے بتادیا۔ اس سے آگے کی بات گائے کو معلوم ہے۔ آنے والی رات کو تو اس سے مل۔ وہ تجھے بہت سی گیان کی باتیں بتائے گی۔"

رات آئی۔ جبالا کا پوت گائے سے ملا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ایسے بیٹھ گئے جیسے اب گائے بات شروع کرنے والی ہے مگر گائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جبالا کا بیٹا بھی جو بہت سوال کیا کرتا تھا چپ رہا۔ بس اسی طرح بیٹھے بیٹھے صبح ہوئی۔ گائے جھرجھری لے کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "اے جبالا کے پوت،

اس مرنے جینے کی سمسیائیں بہت ہیں۔ پر جتنا کچھ مجھے گیان ملا ہے اتنا میں نے تجھے بتا دیا۔ اس سے آگے کی بات ناگ راجہ کو معلوم ہے۔ اب صبح ہو گئی ہے۔ گوالے جاگ پڑے ہیں۔ سب گوئیں چرنے کے لیے چل کھڑی ہوئی ہیں۔ میں بھی جا رہی ہوں۔ رات کو ناگ راجہ تجھ سے ملے گا۔ آگے کی بات وہ تجھے بتائے گا۔

رات آنے پر ناگ راجہ پھنکارتا ہوا آیا اور جبالا کے پوت کے سامنے پھن پھیلا کر گرمڑی مار کر لہرانے لگا۔ پھر ساکت ہو گیا۔ جبالا کا بیٹا دم سادھے چپ بیٹھا اسے تکتا رہا۔ اسی حال میں پوری رات گذری۔ ناگ بھی چپ۔ جبالا کا بیٹا بھی چپ۔ جب پو پھٹی اور چڑیاں چہچہائیں تو ناگ نے جنبش کی۔ کہا۔ "اے جبالا کے بیٹے، دھرتی کے بھید ان گنت ہیں کہ پربتوں سے لے کر پاتال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ بھید جتنے مجھے معلوم تھے وہ میں نے تجھے بتا دیئے مگر اس سے آگے بھی جاننے کے لیے بہت کچھ ہے کہ آگے دھرتی سے آکاش تک دنیا بھید ہی بھید ہے۔ خیر یہ آگے کی باتیں تجھے کاگا بتائے گا جو رات کو تجھ سے آ کر ملے گا۔"

یہ کہہ کر ناگ راجہ لہر کھا کر چلا اور دم کے دم میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ادھر جبالا کا بیٹا پھر رات کی راہ دیکھنے لگا۔ جب رات ہوئی تو کاگا کائیں کائیں کرتا اڑتا ہوا آیا اور جبالا کے پوت کے سامنے آ کر بیٹھ گیا، پر بیٹھتے ہی اس کی کائیں کائیں بند ہو گئی۔ پھر تو وہ گم متھان ہی ہو گیا۔ ادھر جبالا کا بیٹا منہ بند کیے بیٹھا رہا۔ دونوں نے اسی طور چپ بیٹھے بیٹھے رات گذار دی۔ جب رات ڈھل گئی اور اجالا پھیلنے لگا تو کاگا نے اپنے کالے پر پھڑپھڑائے۔ بولا: "اے جبالا کے بیٹے، دھرتی اور آکاش کے بیچ کتنا کچھ ہے۔ جتنا اونچا میں اڑ سکتا ہوں وہ میں نے جانا۔ اس سے آگے کی باتیں میں نے گرڑ دیوتا سے سنیں۔ وہ سب کچھ جو میں جانتا تھا وہ میں نے تجھے بتا دیا۔ باقی جاننے کے لیے باتیں بھی بہت ہیں اور بتانے کے لیے پشو پنچھی بھی بہت ہیں۔" یہ کہہ کر کاگا نے

باز وپھڑ پھڑائے اور اڑ گیا۔

اسی طرح اس بن کے کتنے پشوؤں، پنچھیوں، رینگنے والوں، دوڑنے والوں نے جبالا کے بیٹے کو باتیں بتائیں۔ سرشٹی کے بھید سمجھائے۔ اتنا کچھ جان بوجھ کے وہ اس بن سے نکلا اور لومارشی کے پاس پہنچا۔ چرن چھوئے، ڈنڈوت کی اور کہا۔ "گورو مہاراج میں آگیا ہوں۔"

لومارشی شش کو دیکھ کے خوش ہوئے۔ بولے' اب میں تجھے اپدیش دوں گا۔ اور سرشٹی کے بھید بتاؤں گا۔ جبالا کا بیٹا گورو کے چرنوں میں بیٹھ گیا اور ان کا اپدیش سننے لگا۔ پر جب اپدیش سن چکا تو کسمسا کر بولا: "گورو مہاراج' یہ ساری باتیں تو میں بیل سے سن چکا ہوں۔ مجھے اس سے آگے کی بات بتاؤ۔"

"آگے کی بات۔ اچھا اب تو بھور کا سمے ہو گیا۔ جب رات آئے گی تو پھر بیٹھوں گا اور سمجھاؤں گا۔"

رات آنے پر لومارشی نے اس سے آگے کی باتیں بتائیں' ایسی کہ جانو گیان کی گنگا بہا دی۔ جبالا کا بیٹا پھر بے چین ہوا اور بولا: "مہاراج اتنا گیان تو مجھے تمہاری گیا سے بھی مل گیا تھا' میں تو اس سے آگے کا گیان چاہتا ہوں۔"

لومارشی نے کہا۔

"اس سے آگے کا گیان چاہتا ہے تو اگلی رات کو میرے پاس آکے بیٹھ اور بات دھیان سے سن۔"

سو اگلی رات جبالا کا پوت پھر لومارشی کے چرنوں میں جا بیٹھا اور ان سے گیان کی باتیں سننے لگا۔ پر آخر میں کسمسا کر کہنے لگا کہ "یہ سارا گیان تو مجھے ناگ راجہ سے مل چکا ہے۔ میں اس سے آگے کا گیان مانگتا ہوں۔"

لومارشی نے بات کو پھر اگلی رات پر ٹال دیا اور اگلی رات کو یوں انہوں نے

بہت ودیا کے موتی بکھیرے پر، 'شش' آخر میں پھر اسی طرح کسمسایا اور بولا کہ "مہاراج یہ ساری ودیا تو مجھے کاگا سے مل چکی ہے، مگر میں تب بھی پیاسا تھا۔ اب بھی پیاسا ہوں۔ میرے گورو مہاراج مجھے وہ گیان دو جوان پشو پنچھیوں کے گیان سے آگے کے کھونٹ کا پتا دے۔"

تب لومارشی نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ "اے مرے 'شش'، میں کتنے زمانے تک بنوں میں مارا مارا پھرا۔ کتنے زمانے تک میں نے پشوؤں، پنچھیوں، کیڑے مکوڑوں کے بیچ باس کیا۔ میں نے سارا گیان انہیں سے حاصل کیا ہے۔"

"پر مہاراج، کسی نگر کسی بستی میں کوئی گنی گیانی آدمی بھی تو ملا ہوگا۔"

"آدمی......؟" لومارشی نے حقارت سے کہا۔ "آدمی تو مورکھ ہے اسے اپنے چھل کپٹ، اپنے لڑنے مرنے ہی سے فرصت نہیں۔ اسے کیا گیان ملے گا۔ اور وہ کسی کو کیا گیان دے گا۔"

جبالا کا پوت یہ سن، سوچ میں پڑ گیا۔ کتنی دیر سوچتا رہا۔ پھر جھرجھری لے کر کھڑا ہو گیا۔ لومارشی کے چرن چھوئے۔ پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مہاراج جا رہا ہوں۔ آگیا دو۔"

"کہاں؟"

"وہیں بن کے پشوؤں، پنچھیوں کے بیچ جہاں گیان کی مایا ہے۔"

یہ کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا نرجن بنوں کی طرف نکل گیا۔

کلیلہ نے دمنہ سے کیا کہا

جب دمنہ دن بھر کے سیل سپاٹوں کے بعد شام کو اپنے بھٹ میں پہنچا تو کلیلہ نے پھر وہی روز والا سوال کیا کہ "اے دمنہ آج تو کہاں کہاں گیا اور کیا کیا دیکھا۔"

دمنہ نے جواب دیا: "اے کلیلہ' آج میں جب شیر کے دربار میں گیا تو وہاں عجب ماجرا دیکھا۔"

کلیلہ نے طنز بھرے لہجہ میں کہا: "اچھا تو پھر اس دربار میں پہنچ گیا۔ خیر یہ بتا کہ تو نے وہاں کیا ماجرا دیکھا۔"

دمنہ بولا: "کلیلہ تیری طنز برحق اور تجھے اس طنز کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ ہمارے معتوب ہونے کے بعد تو نے تو دربار سے قطع تعلق کر لیا اور اس بھٹ ہی کو اپنی دنیا سمجھ لیا مگر میں اس طرح ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ دربار سے میں تعلق نہیں توڑوں گا۔ بس تاک میں ہوں کہ کوئی موقع ہاتھ آئے اور میں دربار کے سازشیوں کو نیچا دکھا کر اس مقام کو جو ہم نے کھو دیا ہے پھر حاصل کروں۔ اور آج ایسا موقع میرے ہاتھ آ گیا ہے۔

"وہ کیا موقع ہے اور کیسے ہاتھ آیا۔"

"بتاتا ہوں۔ ابھی میں کہہ رہا تھا کہ میں نے دربار میں عجب ماجرا دیکھا۔ دربار میں پہنچا ہی تھا کہ دور سے آتی ہوئی چنگھاڑ کی ایک آواز سنائی دی۔ ایسی دہشت ناک چنگھاڑ تھی کہ سارے درباری سہم گئے اور جس بات نے مجھے حیران کیا وہ یہ ہے کہ یہ چنگھاڑ سن کر خود شیر بادشاہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔"

"اچھا؟ واقعی؟" کلیلہ نے تعجب سے کہا۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں۔" تھوڑی دیر تک دربار میں سناٹا رہا۔ دیر بعد ایک خوشامدی درباری نے بولنے کی ہمت کی۔ بولا: "یہ کون گستاخ مخلوق ہے جو ہمارے شیر بادشاہ کے ہوتے ہوئے اس جنگل میں آکر اس وحشیانہ انداز میں دڑوک رہی ہے۔"

اس موقع کو میں نے غنیمت جانا۔ فوراً کھڑا ہوا اور شیر کے سامنے ہاتھ باندھ کر گذارش کی "اگر جہاں پناہ حکم فرمائیں تو میں جا کر ٹوہ لوں کہ یہ کون نانہجار جناور آپ کی قلمرو میں گھس آیا ہے اور کس نیت سے آیا ہے۔"

شاید شیر یہی چاہتا تھا کہ دربار میں سے کوئی اس کام کا بیڑا اٹھائے اور بہادری کا ثبوت دے۔ اس نے فوراً ہی میری گذارش قبول کر لی۔

"دمنہ تو بہت بے وقوف ہے کہ اس ناشکرے بادشاہ کے لیے تو اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔"

دمنہ اس پر ہنسا اور بولا: "میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں کہ بیٹھے بٹھائے اپنے لیے خطرہ مول لوں۔ پتہ ہے یہ چنگھاڑ کس جانور کی تھی۔ اگر تجھے یاد ہو تو یہ وہی مریل بیل ہے جسے پچھلے برس ادھر سے گذرنے والا قافلہ یہ سوچ کر پیچھے چھوڑ گیا تھا کہ اب تو یہ مر رہا ہے' اسے ہم کہاں گھسیٹتے پھریں۔ مگر ہمارے جنگل کی گھاس میں عجب تاثیر ہے اسے چر کر یہ بیل مرتے مرتے جی اٹھا اور ایک برس کے اندر اندر اتنا تنومند اور اتنا طاقتور ہو گیا کہ اس کی چنگھاڑ سے اب شیر کو بھی تشویش ہو گئی ہے اور اے کلیلہ میں

تجھے ایک راز کی بات بتاؤں۔ میں نے ہی اس بیل کو اکسایا ہے اور اسے یہ یقین دلادیا ہے کہ ہمارا شیر بوڑھا ہو چکا ہے۔ اب وہ تجھ سے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا۔"

کلیلہ نے یہ سن کر پوچھا: "آخر تیرا منصوبہ کیا ہے۔"

"میرا منصوبہ یہ ہے کہ اس بیل کو شیر سے لڑادیا جائے۔"

"کیوں بیل کی جان کا دشمن ہوا ہے۔"

اس پر دمنہ ہنسا اور بولا: "اے دمنہ سیاست کی کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی۔ سیاسی کھیل میں لیڈر لوگ بڑی بڑی شخصیتوں کو مروادیتے ہیں۔ یہ تو خالی ایک بیل ہے۔ میں ادھر بیل کو اکساؤں گا اور ادھر شیر پہ احسان جتاؤں گا کہ دشمن کو آپ کے پالے میں لے آیا ہوں۔ یہ بیل ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسے مارلو۔ اور یوں میں شیر کی نظروں میں دوبارہ اعتبار سے حاصل کروں گا اور اپنے خلاف سازش کرنے والوں کو نیچا دکھاؤں گا۔"

کلیلہ یہ منصوبہ سن کر بہت پریشان ہوا۔ کہنے لگا: "اے دمنہ تو تو اب آدم زاد کی روش پہ چل نکلا ہے جیسے وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور سیاسی چالیں چلتے ہیں ویسے ہی تو کر رہا ہے۔ گیدڑ ہو کر تجھے آدم زاد والی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

دمنہ یہ سن کر ہنسا اور بولا: "کلیلہ تو بھٹ میں بیٹھا رہتا ہے۔ تجھے دنیا کا کچھ پتہ بھی ہے۔ یہ دنیا اب گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ آدم زاد اور گیدڑ گدھے اور گھوڑے اب سب ایک برابر ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

میں نے آدم زاد کو گیدڑ بنتے دیکھا ہے اور کتنے گیدڑوں کو آدم زاد کے

بھیس میں چلتے پھرتے دیکھا ہے اور مجھے لیڈروں کی اس روش پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آخر انہیں بھی اس دنیا میں رہنا ہے۔"

کلیلہ نے دمنہ کی یہ تقریر حیرت سے سنی اور کہا کہ "اے دمنہ یہ آدم زاد کی زبان ہے جو تو بول رہا ہے۔"

دمنہ نے جواب دیا: "آدم زاد اور گیدڑوں میں اس قسم کی تفریق کرنا پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ یہ نیا زمانہ ہے اور ہم کمپیوٹر ایج میں داخل ہو چکے ہیں جو زبان آدم زاد کی وہی گیدڑوں کی اور جو چال گیدڑوں کی وہی آدم زاد کی' اور گیدڑوں کی نئی نسل اب بھٹوں میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ نوجوان ترقی کی دوڑ میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ آخر گیدڑ بنے کب تک بیٹھے رہیں۔"

اس پر کلیلہ نے زہر خند کیا اور کہا کہ "شاید تو نے درویش اور چوہیا کی کہانی نہیں سنی۔"

دمنہ نے پوچھا: "وہ کہانی کیا ہے' میں بھی تو سنوں۔"

"تو لے سن" اور کلیلہ نے کہانی اس طرح سنائی۔ ایک پہنچا ہوا درویش ایک پیڑ تلے بیٹھا تھا کہ ایک چیل جس نے چونچ میں ایک چوہیا دبوچ رکھی تھی' اس پیڑ پر آکر بیٹھی۔ وہ اس چوہیا کو کھانے لگی تھی کہ وہ تڑپ کر اس کی چونچ سے نکل نیچے درویش کے سامنے آپڑی۔ درویش کو چوہیا پر بہت ترس آیا۔ اس نے اسے پیار سے اٹھایا' پچکارا اور اسے اپنی کٹیا میں لے گیا۔ پھر اس کے لیے وظیفہ پڑھا اور دعا کی کہ اے پاک پروردگار اس چوہیا کی اپنی قدرت سے جون بدل دے اور اسے انسانی مخلوق بنا دے۔ دعا قبول ہوئی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ ایک خوبصورت خوب سیرت لڑکی بن گئی۔ ایسی خوبصورت اور ایسی گنوں والی کہ اچھے اچھے جوان اس سے شادی کے لیے درویش کی منتیں کرنے لگے۔ درویش نے اس سے کہا کہ اے مری نور نظر میں چاہتا ہوں کہ اب

تیری شادی کر دوں مگر یہ کام تیری مرضی سے کروں گا۔ بتا کیسا شوہر چاہتی ہے۔ وہ بولی:
"میں ایسا شوہر چاہتی ہوں جو شان و شوکت والا ہو' خوبصورت ہو۔"

درویش نے کہا کہ "اے بھاگوں بھری' جو صفات تو نے گنائیں وہ تو چاند میں پائی جاتی ہیں۔ میں چاند سے کہتا ہوں کہ تجھ سے بیاہ کر لے۔"

چاند نے جب یہ سنا تو کہا کہ "اے درویش اپنے سے زیادہ شان و شوکت والے کا پتہ دیتا ہوں۔ ابر کی شان و شوکت مجھ سے زیادہ ہے۔ جب نمودار ہوتا ہے تو مجھ پہ چھا جاتا ہے۔ میری ساری چاندنی اس کے سائے میں آکر گم ہو جاتی ہے۔"

تب درویش نے ابر کے سامنے یہ سوال ڈالا۔ ابر نے کہا کہ "ہوا کا زور' اس کی شان و شوکت مجھ سے زیادہ ہے۔ جب' تیز چلتی ہے تو مجھے اڑا کر لے جاتی ہے۔"

درویش نے یہ سن کر ہوا سے رجوع کیا۔ ہوا نے کہا کہ اے درویش شان و شوکت جو پہاڑ کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ میرا زور سب پر چلتا ہے مگر کیسا ہی جھکڑ چلے پہاڑ کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ تب درویش اپنی درخواست پہاڑ کے پاس لے کر گیا۔ پہاڑ نے کہا کہ "اے درویش مجھے شان و شوکت حاصل ہے۔ میرا بہت وقار بہت دبدبہ ہے مگر چوہے کے سامنے میری نہیں چلتی۔ وہ بے خوف و خطر مجھے کھودتا ہے' میرے اندر بل بناتا ہے اور میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اس پر لڑکی ترت بول اٹھی کہ "پہاڑ صحیح کہتا ہے۔ چوہا پہاڑ سے زیادہ طاقتور ہے۔ میں اسی سے بیاہ کروں گی۔"

چوہے کو جب درویش نے اس نازنین کا پیغام دیا تو اسے بھی اس نازنین میں کشش نظر آئی۔ وہ فوراً آمادہ ہو گیا لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی کہی کہ یہ دراز قد نازنین' میں چوہا۔ نبھے گی کیسے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ یہ بی بی چوہیا ہوتی۔"

لڑکی نے فوراً کہا کہ "درویش نے اگر دعا کر کے مجھے چوہیا سے انسانی مخلوق

بنایا ہے تو دعا کر کے پھر سے چوہیا بھی بنا سکتا ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی التجا بھری نظروں سے درویش کو دیکھا۔ درویش نے سوچا کہ دولہا دلہن راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ اگر اس کی مرضی پھر چوہیا بننے کی ہے تو پھر یہی سہی۔ اس نے دعا کی اور چوہیا پھر سے چوہیا بن گئی۔

جب کلیلہ یہ کہانی سنا چکا تو دمنہ نے کہا کہ آخر اس کہانی کا مطلب کیا ہے۔

کلیلہ نے کہا کہ "اے گیدڑ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنی اصل سے کتنا ہی بھاگے اور کتنا ہی اونچا اُڑے، وہ ہر پھر کر اپنی اصل ہی کی طرف جاتا ہے۔ تو جو گیدڑ ہے وہ کچھ کر لے گیدڑ ہی رہے گا جیسے چندروا گیدڑ کے ساتھ ہوا کہ اس نے سمجھا کہ وہ گیدڑ سے بڑھ کر کچھ بن گیا ہے لیکن ساری کوشش کے باوجود رہا وہی گیدڑ کا گیدڑ۔

دمنہ نے پوچھا کہ "یہ چندروا گیدڑ کون تھا اور اس کا کیا قصہ ہے۔

کلیلہ نے کہا: "اچھا تو نے چندروا کا قصہ نہیں سنا ہے۔ تو لے پھر سن۔" اور اس نے چندروا کا قصہ اس طرح سنایا۔

کسی جنگل میں چندروا نام کا ایک گیدڑ رہتا تھا۔ ایک روز وہ بہت بھوکا پھر رہا تھا۔ جنگل میں اسے کھانے کو کچھ نہ ملا تو قریب کی ایک بستی کی طرف نکل گیا۔ وہاں کتوں نے دیکھا کہ یہ کون اجنبی یہاں آن گھسا۔ انہوں نے اسے بھنبھوڑ ڈالا۔ وہ ان سے جان بچا کر بھاگا۔ پناہ لینے کے لیے وہ ایک گھر میں گھس گیا۔ وہ نکلا کسی رنگریز کا گھر۔ وہاں ناند میں نیل گھلا رکھا تھا۔ چندروا ایسا گھبرایا ہوا تھا کہ اوندھے منہ اس ناند میں گر پڑا۔ بڑی مشکل سے اس میں سے نکلا۔ پھر یہاں سے جان بچا کر بھاگا۔

جب واپس جنگل میں گیا تو جس جانور نے اسے دیکھا وہ ڈر گیا کہ یہ کونسی ہیبت ناک مخلوق اس جنگل میں آ گئی۔ اصل میں اب تو وہ سر سے پاؤں تک نیلا ہو گیا تھا اور ایسی ہیئت ہو گئی تھی کہ اسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ شیر، چیتے، ہاتھی، بھیڑیے ایسے جانور

بھی جن کی جنگل میں بہت دھاک تھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ چندروا کی سارے جنگل پہ دھاک بیٹھ گئی۔ اب اس نے بڑے اعتماد سے سب جانوروں کو پکارا اور یوں خطاب کیا کہ اے مرے عزیز حیوانو، مجھ سے دور کیوں بھاگتے ہو، میں تمہارا دشمن نہیں، دوست ہوں۔ برھما نے خاص اپنے ہاتھوں سے یہ سوچ کر بنایا ہے کہ اس جنگل میں بہت نراج ہے۔ ایسی آپا دھاپی ہے کہ ہر ایک کو اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔ دوسروں کا کیا حال ہے، یہ کوئی نہیں سوچتا تو اس جنگل میں کوئی راجہ ہونا چاہیے۔ ایسا جو جانوروں میں انصاف کرے اور جنگل میں امن و امان قائم کرے۔ تو جان لو کہ میں تمہارا راجہ ہوں اور تم میری پیاری رعایا۔ کوکودرونٹرا میرا نام ہے۔ تو میں ہوں راجہ کوکودرونٹرا۔"

اس خطاب نے اپنا اثر کیا۔ جنگل کے سارے جانوروں نے اس کے آگے ماتھا ٹیک دیا اور نعرہ لگایا مہاراجہ کوکودرونٹرا کی جے۔ پھر گڑگڑا کر پوچھا: "مہاراج، ہمارے لیے اب کیا حکم ہے۔"

راجہ کوکودرونٹرا نے تخت پر بیٹھ کر سب جانوروں کے لیے حکم احکامات جاری کیے، مگر گیدڑوں سے کہا کہ تم بہت پاپی ہو۔ اس جنگل سے فوراً نکل جاؤ۔ اب کوئی گیدڑ یہاں دکھائی دیا تو اسے جیتا نہ چھوڑوں گا۔

یہ حکم سن کر بے چارے گیدڑ روتے پیٹتے جنگل سے نکل گئے۔ باقی جانور ہنسی خوشی رہنے لگے۔ وہ شکار مار کر لاتے اور راجہ کوکودرونٹرا کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیتے۔ وہ اچھا اچھا شکار اپنے لیے رکھ لیتا۔ باقی کے حصے لگا کر ان میں بانٹ دیتا۔

تو اب جنگل میں سب جانور راجہ کوکودرونٹرا کی مالا جپتے۔ ہر دم پکارتے مہاراج کی جے اور مہاراجہ پورے جنگل میں دندناتے پھرتے مگر ایک روز کیا ہوا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ مہاراجہ سیر کے لیے نکلے۔ چلتے چلتے دور نکل گئے اور جنگل کے کنارے تک پہنچ گئے۔ وہاں کہیں قریب ہی سے

گیدڑوں کا غل شور سنائی دیا۔ اپنے ہم جنسوں کی آوازیں سن کر کوکودرونڑا کو بھی پھریری آئی۔ وہ یہ بھول گیا کہ وہ تو اب اپنے حساب سے گیدڑ نہیں رہا ہے۔ اس کی گیدڑ والی فطرت عود کر آئی۔ مستی میں آ کر اس نے گیدڑانہ انداز میں غل شور مچانا شروع کر دیا۔

کوکودرونڑا کی گیدڑوں والی چیخیں سن کر شیر چیتے ہاتھی بھیڑیے جو اس کے آگے پیچھے غلامانہ انداز میں چل رہے تھے ایک دم سے چونک پڑے۔ سب کے منہ سے بیک وقت نکلا کہ ارے یہ تو چندروا گیدڑ ہے۔ پہلے تو ان پر یہ سوچ کر گھڑوں پانی پڑ گیا کہ وہ اتنے کائیاں اور اتنے دلیر ہونے کے باوجود ذلیل چندروا کی گیدڑ بھبکی میں آ گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ شرمندہ رہے۔ پھر انہیں غصہ آیا اپنے آپ پہ بھی اور چندروا پر بھی۔ پھر ان کا پارہ اتنا چڑھ گیا کہ وہ سب چندروا پہ پل پڑے۔ گھڑی بھر میں اس کی تکا بوٹی کر دی۔

کلیلہ یہ کہانی سنا کر چپ ہوا پھر بولا: "گیدڑ لاکھ رنگ بدلے گیدڑ ہی رہے گا اور جس کی جو اصل ہے اسے لاکھ چھپاؤ وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اور جو اپنی اصل چھپائے گا اس کا وہی انجام ہو گا جو چندروا کا ہوا۔"

دمنہ بیزاری سے بولا: "اے کلیلہ، تو تو بالکل رجعت پسند ہو گیا۔ جو لوگ زندگی سے رشتہ توڑ لیتے ہیں اور زمانے کی تبدیلیوں کو دیکھنے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں ان کا یہی انجام ہوتا ہے تو بھٹ ہی میں نہیں اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا ہے اور ماضی کے قصوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ میرے دوست بھٹ سے باہر آ اور اپنے خول سے نکل کر دیکھ کہ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ چندروا قسم کے گیدڑوں کا زمانہ گذر گیا ہے۔ نئے زمانے کے گیدڑوں میں انقلابی خیالات تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ وہ بھٹوں سے باہر نکل آئے ہیں اور گیدڑوں والے پرانے طور طریقوں سے بغاوت پر اترے ہوئے

ہیں۔ وہ ایک نئی زندگی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

اس پر کلیلہ نے زہر خند کیا اور کہا کہ "تو کہتا ہے کہ میں اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا ہوں اور تو اس پر خوش ہے کہ نئے زمانے کے گیدڑ اپنے خول میں بند نہیں ہیں اور انقلاب کی راہ پر گامزن ہیں۔ مگر کلیلہ یہ کہتا ہے کہ گیدڑ کو اپنی کھال میں رہنا چاہیے ورنہ اس کا اس بندر والا حشر ہوگا جس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر جست لگائی اور بڑھئی کے کام میں دخل در معقولات کر کے ذلیل و رسوا ہوا۔"

دمنہ نے پوچھا: "وہ بندر کون تھا اور اس نے بڑھئی کے کام میں کس طرح دخل در معقولات کی۔"

کلیلہ نے کہا کہ "اچھا' تو نے بندر اور بڑھئی کا قصہ نہیں سنا۔ تو پھر سن۔ اور اگر خدا تجھے توفیق دے تو انقلاب کے خواب دیکھنے والے بندروں کو بھی یہ قصہ سنا۔"

اور پھر کلیلہ نے یہ قصہ اس طرح سنایا۔

ایک بڑھئی اپنے ٹھکانے پہ بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔ ارد گرد خوبصورت ترشے ہوئے پٹرے پڑے تھے اور وہ ایک لکڑی پر بیٹھا اس کو چیر رہا تھا۔ دو میخیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ ایک کو لکڑی کے شگاف کے اندر رکھتا تاکہ لکڑی کو پھاڑنے میں آسانی رہے۔ جب شگاف زیادہ چوڑا ہو جاتا تو آگے دوسری میخ گاڑتا اور اس میخ کو نکال لیتا۔

ایک بندر اوپر درخت پر بیٹھا یہ دیکھ رہا تھا وہ بڑھئی کے ہنر سے بہت متاثر ہوا۔ دل میں سوچا کہ میں بھلا کیوں بے مقصد بے سبب درختوں دیواروں پہ کودتا پھرتا ہوں۔ کوئی ہنر سیکھوں کہ ہنر مند کی بہت عزت ہوتی ہے۔ بڑھئی کا ہنر میں نے دیکھ لیا ہے۔ اسے آسانی سے سیکھ سکتا ہوں۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ بڑھئی کسی کام سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ بندر نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ تیزی سے درخت سے اترا اور بالکل بڑھئی کے انداز میں لکڑی پر بیٹھ کر شگاف میں میخ ٹھوک کر اسے چیرنے لگا۔ جب

شگاف چوڑا ہو گیا تو اس نے آگے سرک کر دوسری میخ آگے گاڑی اور اس میخ کو جلدی سے نکال لیا۔ لیکن تھا تو اناڑی، میخ جو نکالی تو اس کے دونوں خصیئے شگاف کے بیچ میں آکر پھنس گئے۔ وہ درد سے چلّانے لگا۔ چلّاتا تھا اور کہتا تھا کہ ارے لوگو مجھے بچاؤ۔ میری توبہ۔ میں بندر بھلا۔ بڑھئی کا ہنر بڑھئی کو مبارک رہے۔

اتنے میں بڑھئی واپس آگیا۔ اس نے لکڑی چیر کر اسے آزادی تو دلا دی مگر ایسی مار ماری کہ بندر اپنی سات پشتوں سے کہہ مرا کہ تم بندر ہو، بندر ہی رہنا، بڑھئی کے ہنر کی ریس مت کرنا۔

یہ کہانی سنا کر کلیلہ نے کہا کہ "اے دمنہ، گیدڑ کو چاہیے کہ اپنی کھال میں رہے اور اپنی اوقات کو پہچانے۔ اپنی اوقات سے بڑھ کر کچھ کرنے کی کوشش کرے گا تو بندر کی طرح ذلیل و رسوا ہوگا۔"

دمنہ یہ باتیں سن کر بہت بور ہوا۔ چڑ کر بولا کہ: "کسی نے سچ کہا ہے کہ گوہ کا کیڑا گوہ ہی میں خوش رہتا ہے۔ تیری پست ہمتی تجھے اس بھٹ سے نہیں نکلنے دے گی مگر میرے عزائم بلند ہیں۔ تیری صحبت میں بیٹھوں گا تو ایسے ہی بیکار کے قصے کہانیوں میں وقت ضائع کروں گا۔ سو میں چلتا ہوں اگر میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا تو میرا ہی نہیں پوری گیدڑ قوم کا مقدر بدل جائے گا۔ تو دیکھے گا کہ پھر شیر نام ہی کا بادشاہ ہوگا۔ جنگل کا سارا اقتدار گیدڑوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔"

یہ کہہ کر دمنہ تیزی سے بھٹ سے نکلا اور تیر کی طرح شیر کے دربار کی طرف چلا۔

کلیلہ اس کے اس طرح جانے پر بہت بے مزہ ہوا۔ بڑبڑایا کہ علامہ صاحب نے سچ کہا ہے کہ

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

پھر ٹھنڈا سانس بھر کر کہا کہ اللہ گیدڑوں کی حالت پر رحم کرے۔ نئی تہذیب نے انہیں اندھا کر دیا ہے کہ اپنے کلچر میں انہیں سوائے خرابی کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ پھر وہ چپ ہو گیا۔ کتنی دیر تک اداس اداس گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے سرہانے سے پنچ تنتر اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

دمنہ کیوں ہنسا، کلیلہ کیوں رویا

کلیلہ نے دمنہ کی بے خبری پر تعجب کیا اور پوچھا "اے دمنہ، کیا تو نے واقعی کوّے اور اُلّو کی دشمنی کا قصہ نہیں سنا۔"

"نہیں، میں نے تو یہ قصہ نہیں سنا۔ تجھے معلوم ہے تو سنا کہ ان دونوں میں ایسی دشمنی کیسے پیدا ہوئی کہ ایک دوسرے کے وجود کو برداشت نہیں کرتے۔"

کلیلہ نے یہ بات سن کر اس کی بے خبری پر افسوس کیا اور پھر اسے پورا قصہ سنایا۔

ہوا یوں کہ اس جنگل میں اچھا بھلا رہتے رہتے اچانک سے بعض پرندوں کے دماغ میں یہ ہلہلا اٹھا کہ ہمارا بھی کوئی بادشاہ ہونا چاہیے، یہ کیا کہ نہ کوئی قاعدہ، قانون، نہ کسی قسم کا نظم و ضبط، ہر پنچھی اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ کوئل کی کوک، مور کی جھنکار، پپیہے کی پکار، کوؤں کی کائیں کائیں، طوطوں کی ٹائیں ٹائیں، کھٹ بڑھیا کی کھٹ کھٹ، کبوتروں کی غٹرغوں، اس بھانت بھانت کی بولی نے تو اچھا خاصا نراج پیدا کر دیا ہے۔

اس دلیل نے اپنا اثر کیا۔ پرندوں کے دلوں میں یہ بات گھر کر گئی کہ ان کا بھی کوئی بادشاہ ہونا چاہیے جو قاعدے قانون کے ساتھ حکومت کرے بادشاہ کون ہو،

اس پر بھی پرندوں نے بھانت بھانت کی بولی بولی۔ خیر رفتہ رفتہ سب اس پر اتفاق رائے کر چلے تھیکہ اُلّو کو بادشاہ بنایا جائے۔ سب ہی اس کے قائل نظر آئے کہ اُلّو بہت عقلمند ہے۔ بہت ثقہ ہے۔ نہ کائیں کائیں نہ ٹائیں ٹائیں۔ سب سے الگ چپ چاپ ٹھنٹھہ پہ بیٹھا غور و فکر کرتا رہتا ہے۔

اس ایک نام پر اتفاق رائے ہو چلا تھا کہ کسی پنچھی کو خیال آیا کہ اس پنچائت میں کوا تو کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ جھٹ اڑ کر کوے کے پاس پہنچا اور کان میں کہا کہ کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ اُلّو بادشاہ بن رہا ہے۔ کوے کو بہت تاؤ آیا کہ بادشاہت کا فیصلہ ہو رہا ہے اور اسے کوئی پوچھ ہی نہیں رہا۔ فوراً اڑ کر آیا اور چندرا چندرا کر پوچھنے لگا کہ کیا مسکوٹ ہو رہی ہے۔

پرندوں کو اب احساس ہوا کہ ان کے بیچ جو سب سے سیانا ہے وہی اس مشورے میں شامل نہیں تھا۔ انہوں نے بہت معذرت کی اور پھر بتایا کہ سب کی رائے یہ ہے کہ اُلّو کو بادشاہ بنایا جائے۔

کوا معنی خیز انداز میں مسکرایا مگر چپ رہا۔ پرندے اس پر چکرائے کہ آخر بولا کیوں نہیں اور معنی خیز انداز میں مسکرایا کیوں۔

"اے بھائی کوے، کچھ بولو، تمہاری کیا صلاح ہے۔"

"ارے یارو تم نے طے کر ہی لیا ہے تو میں کیا بولوں۔"

"نہیں فیصلہ تو ابھی نہیں ہوا ہے جو رائے عامہ ہے وہ ہم نے تمہیں بتائی ہے۔"

"رائے عامہ۔" کوا زہر بھرے لہجہ میں بڑبڑایا اور پھر علامہ اقبالؒ کا یہ مصرعہ پڑھا ع

که از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

اب تو پرندے اور بھی پریشان ہوئے۔ اصرار کیا کہ صاف صاف کہو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔

تب کوا یوں بولا کہ "میں تو بادشاہت ہی کے خلاف ہوں۔ آدم زاد کی مثال سامنے ہے۔ اس مخلوق کو بادشاہوں سے اب تک کیا فیض پہنچا ہے۔ اس کا تلخ تجربہ تمہارے سامنے ہے۔ پھر بھی تم عقل نہیں پکڑتے۔"

بس پھر ایک نئی بحث شروع ہو گئی۔ بادشاہ ہونا چاہیے یا نہیں ہونا چاہیے۔ بادشاہت کے فائدے کیا ہیں' نقصانات کیا ہیں۔ بحث تو بہت ہوئی مگر پنچھیوں کے دماغ میں جو خناس سما گیا تھا وہ نکلا نہیں۔ آخر کو اکثریت اسی حق میں نظر آئی کہ بادشاہ ہونا چاہیے۔ طائرانہ زندگی اب اتنی بڑھ پھیل گئی ہے کہ جب تک کوئی حکمران نہ ہو امن وامان قائم نہیں ہو سکتا۔

تب کوا بولا کہ "بھائیو پھر اگر بادشاہ بنانا ہی ہے تو کسی ایسے کو بناؤ جس کے سر پر یہ تاج سجے۔ مور کو دیکھو' رنگ برنگ' یہ لمبی دم دم پہ سنہری پیسہ' سر پر کلغی' چال شاہانہ سچ مچ پرندوں کا بادشاہ لگتا ہے یا پھر ہدہد ہے اس کے سر پہ تو سچ مچ تاج رکھا ہوا ہے۔ ارے الوؤ' تم نے اُلو میں کیا صفت دیکھی کہ اسے بادشاہ بنانے لگے ہو۔ تم تو بالکل چغد نکلے۔"

اس پر محفل میں سناٹا چھا گیا مگر ایک پرندے نے جرأت دکھائی۔ پھڑ پھڑا کر بولا "اُلو عقلمند پرندہ ہے۔"

اس پر کئی اور پرندوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اچھا تو گویا اُلو عقلمند پرندہ ہے۔" کوے نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

پھر بولا: "پنچھیو' کیا تم نے خرگوش تیتر اور بلی کی کہانی سنی ہے۔"

"نہیں' وہ کیا کہانی ہے۔"

"نہیں سنی تو لو سنو۔"

اور کوے نے خرگوش، تیتر اور بلی کی کہانی اس طرح سنائی۔ کسی جنگل میں ایک بڑے سے تنے والا ایک پرانا پیڑ تھا۔ اس کی جڑ میں ایک کھکھل تھی۔ اس کھکھل میں ایک تیتر بسیرا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ تیتر جنگل کے دوسرے تیتروں کے سنگ کہیں دور نکل گیا۔ اتنی دور کہ کئی دن تک واپس نہ آسکا۔ جب واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کھکھل پر کسی اجنبی نے قبضہ کر لیا ہے۔ یہ اجنبی ایک خرگوش تھا۔ اصل میں یہ خرگوش ٹھکانے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا تھا۔ پھرتا پھراتا وہ اس درخت کے پاس آنکلا۔ دیکھا کہ درخت میں ایک آرام دہ کھکھل ہے جو خالی پڑی ہے۔ بس اس نے اس کھکھل میں ڈیرا ڈال لیا۔ اب جو تیتر واپس آیا اور اس نے خرگوش کو وہاں براجمان دیکھا تو کہا "اب سمجھ میں یہ مثل آئی کہ خانۂ خالی را دیو می گیرد۔ اے میاں خرگوش یہ ہمارا گھر ہے۔ بستر بوریا سمیٹو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

خرگوش نے جواب دیا: "درخت کی کھکھل کسی کی جاگیر نہیں ہوتی، خالی پڑی تھی۔ میں نے یہاں اپنا گھر بسا لیا اور اب تو یہاں میں نے کئی راتیں گذاری ہیں۔ سو اب یہاں میرا بسیرا ہے۔ تمہاری یہاں نال تھوڑا ہی گڑی ہے۔ کہیں اور جا کے ٹھکانا کر لو۔"

بس پھر دونوں میں ٹھن گئی۔ ایسی ٹھنی کہ بات تھانے کچہری تک پہنچی۔ انہیں منصف بھی ملا تو کونسا بلی، اصل میں جب تیتر اور خرگوش میں دھت تیری کی اور ہت تیری کی ہو رہی تھی تو ایک بلی ادھر سے گذری۔ اس کے کان کھڑے ہوئے۔ چھپ کر سننے لگی کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جھگڑتے جھگڑتے ایک نے کہا کہ کسی کو پنچ بنا لیں۔ تیتر نے کہا اور خرگوش نے مان لیا۔ بس یہ سن کر بلی وہاں سے سٹک لی۔ کہیں آگے جا کر ایک پیڑ تلے آنکھیں موند کر ایسے بیٹھ گئی جیسے بڑی اللہ والی ہے اور مراقبہ میں ہے۔

تیتر اور خرگوش پنچ کو تلاش کرتے کرتے اس پیڑ کے پاس سے گذرے۔ بلی کو اس کیفیت میں دیکھ کر ٹھٹکے۔ بلی نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ دونوں کو دیکھا اور مسکین آواز میں بولی: "میاؤں میاؤں، کیوں میری عبادت میں خلل ڈالتے ہو۔ آگے جاؤ۔"

اب تو ان دونوں کو یقین آگیا کہ ضرور یہ کوئی پہنچی ہوئی بزرگ بی بی ہے۔ لجاجت سے بولے: "بڑی بی، ہمارا ایک مقدمہ ہے، اگر تم ہماری بیچ پنچ بن جاؤ اور ہمارا جھگڑا چکا دو تو یہ بھی عبادت ہی ہو گی۔"

بلی نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولی "اے بیٹو، میں نے تو دنیا کے قصوں بکھیڑوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ میں اب بھلا کوئی کچہری لگا کے بیٹھوں گی۔ میں نے تو خود اپنا مقدمہ اللہ میاں کی کچہری میں پیش کر رکھا ہے۔ دعا کرو کہ اس بڑی کچہری سے میرے حق میں فیصلہ ہو جائے اور میرے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں۔"

اب تو یہ دونوں اور بھی اس کے گرویدہ ہو گئے اور لگے اس کی منتیں کرنے۔

آخر بلی کا دل موم ہو گیا۔ بولی "میاؤں میاؤں، اللہ کے نیک بندو، کیوں لڑتے ہو، آخر تمہارے بیچ جھگڑا کیا ہے۔"

دونوں نے اپنی اپنی بات کہنی شروع کی۔ بلی نے پھر اسی مسکینی سے کہا کہ "ارے بیٹو، تم کیا کہہ رہے ہو۔ بڑھاپے نے تو میرے کان پٹ کر دیئے ہیں۔ دور کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ قریب آکر میرے کان میں کہو۔"

خرگوش اور تیتر قریب آنے لگے تھے مگر آخر وہ بلی تھی۔ وہ سہم کر پھر پیچھے ہٹ گئے۔ اس پر بلی روئی اور بولی "میرے برے نصیب ہیں کہ پچھلے گناہ میرے ساتھ ایسے چمٹے ہیں کہ اب بھی لوگ مجھے پہلے کی طرح پاپن سمجھتے ہیں۔ ارے نیک بختو، اب نہ میرے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت نہ پنجوں میں وہ تیزی۔ ارے اب تو میں ان

پنجوں سے ٹڈی کو بھی نہیں دبوچ سکتی۔"

خرگوش اور تیتر دونوں ہی بلی کے اس میاؤں میاؤں بھرے لہجے سے بہت متاثر ہوئے اور جھٹ قریب آن بیٹھے۔ لگے بڑی بی کو دلاسا دینے۔ تیتر دائیں اور خرگوش بائیں۔ دونوں نے اپنا اپنا موقف پیش کیا۔ "بلّی بلّی 'اب تم ہی انصاف کرو......"
ابھی وہ یہ کہتے تھے کہ بلی نے ایک دم سے پنجے نکالے۔ ایک پنجہ مار کر تیتر کو منہ میں دبایا۔ دوسرا پنجہ مار کر خرگوش کو دبوچا۔ ایک وار میں دو شکار کر لیے۔

کوے نے کہانی ختم کی "پنچھیو 'کہانی تو سن لی کچھ سمجھے بھی۔"

پرندے حیران و پریشان کہ یہ کیسی کہانی ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس پر کوا ہنسا اور بولا "بھولے پنچھیو 'اس کہانی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ خرگوش اور تیتر تو نادان تھے۔ انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ بلی تو سدا سے ان کی جان کی بیری ہے۔ وہ ان کے بیچ کیسے انصاف کرے گی۔ مگر تم تو چغد مت بنو اور سوچو کہ الو پرندوں کا کب دوست ہوا ہے۔ یوں بڑا اللہ والا بنتا ہے۔ دن بھر آنکھیں موندے چونچ بند کیے گم سم بیٹھا رہتا ہے لیکن رات پڑے پر جب کوئی اسے دیکھنے والا نہیں ہوتا تو کیسی کینچلی بدلتا ہے۔ کوئی پرندہ نظر آجائے کیسا اس پر جھپٹتا ہے۔ ایسے منافق اور مکار کو تم بادشاہ بناؤ گے۔"

پرندوں کے سر ندامت سے جھک گئے۔

پھر کوے نے آخری پتہ پھینکا۔ "الوؤ' آدمیوں کا حال دیکھو اور سبق حاصل کرو۔ کتنی جلدی وہ عیاروں بے ایمانوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں۔ ان کے وعدوں پر اعتبار کر لیتے ہیں اور انہیں حاکم بنا لیتے ہیں۔ پھر یہ بے ایمان حاکم بن جانے کے بعد ان کا خون چوستے ہیں۔

پرندے کوے کی یہ باتیں سن کر ایسے حواس باختہ ہوئے کہ فوراً ہی کان پکڑے کہ نا بابا الو کو ہم بادشاہ نہیں بنائیں گے۔

کوؤں نے اس خوشی میں ڈھول بجانا شروع کر دیا۔

کسی پنچھی نے الو کو یہ خبر جا سنائی۔ الو کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کوے کو خبر دار کیا کہ "اے کالے کوے تو نے بہت کائیں کائیں کر لی۔ تو نے میرے خلاف سازش کی۔ سمجھ لے کہ آج سے میں تیری جان کا بیری ہوں۔"

کلیلہ جب یہ کہانی سنا چکا تو دمنہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔ کلیلہ نے تعجب سے پوچھا: "اے دمنہ یہ تو رونے کا مقام تھا' کیا باعث ہے کہ تو نے رونے اور عبرت پکڑنے کی بجائے ہنسنا شروع کر دیا۔"

دمنہ بولا: "اے کلیلہ 'میں یہ سوچ کر ہنسا کہ الو اور کوے تو بالکل آدم زادوں کے نقال بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے جنگل میں جو آدم زاد آ کر بسے ہیں وہ اسی طرح دو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کے بیچ زمین کا بٹوارہ ہو گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی دیواریں کھڑی کر لیں مگر کم نصیبوں کو پھر بھی چین نہیں آیا۔ لڑے چلے جا رہے ہیں۔ بالکل کوے اور الّو بن گئے ہیں۔"

کلیلہ نے کہا: "اے دمنہ 'تو نے صحیح تاڑا' مگر یہ نہیں سوچا کہ ان نیک بختوں کے بسنے سے پہلے اس جنگل میں امن چین تھا' محبت تھی' بھائی چارا تھا' یہ جو آدم زاد یہاں آ کر آباد ہوئے اور دو ٹکڑیوں میں بٹ کر سر پھٹول کرنے لگے انہوں نے ہمارے جنگل کی فضا میں زہر بھرا ہے اور پرندوں کو خراب کیا ہے۔ اب ان کے بھی لچھن آدم زادوں والے ہیں۔ وہی سازشیں' وہی جھوٹ فریب' وہی سیاسی چالیں' اسی طرح کی لڑائی بھڑائی۔ اب تو اپنے حال پر غور کر۔ شیر کے دربار میں جا کر سازشیں کرتا ہے۔ بھلا گیدڑوں کو ایسی باتیں زیب دیتی ہیں۔ یہ تو آدمیوں کا وطیرہ چلا آتا ہے۔" چپ ہوا اور پھر بولا: "گیدڑ اب کہاں کے گیدڑ رہ گئے ہیں۔ ان کے اندر جو روح شغالی تھی وہ تو مر گئی۔

"ہائے افسوس گیدڑوں کی خالی کھال رہ گئی' روح شغالی نہ رہی۔"

دمنہ ایک بار پھر منہ پھاڑ کر ہنسا اور کلیلہ کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اے دمنہ' اب تو کیا سوچ کر ہنسا اور آدم زادوں والی نظروں سے مجھے کیوں دیکھ رہا ہے۔"

"اے کلیلہ' مجھے وہ مثل یاد آگئی کہ دیگراں رانصیحت خودرا فضیحت۔ تو گریہ کر رہا ہے کہ گیدڑ اب گیدڑ نہیں رہے۔ مجھے تو آدم زادوں کا پیرو بتا رہا ہے۔ ذرا اپنے حال پہ تو غور کر۔ کبھی کبھی میں شک میں پڑ جاتا ہوں کہ تو گیدڑ ہے یا حکیم لقمان ہے۔"

دمنہ کا یہ کلام سن کر کلیلہ رویا اور بولا: "اے میرے عزیز دوست' آج تو نے حق دوستی ادا کیا اور مجھے آئینہ دکھایا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میری تو وہ مثل ہو گئی کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ اس پنڈت کا جس کا نام وشنو شرما تھا بڑا ہو کر اس نے اپنی پنچ تنتر کے چکر میں میرے منہ میں حکایتیں ڈال ڈال کر یہ حال کر دیا ہے کہ گیدڑوں والی کوئی بات ہی مجھ میں نہیں رہ گئی اور لاکھ میں لقمانیت بگھاروں آدم زاد میں بن نہیں سکوں گا۔ گیدڑ کو چاہیے کہ اپنی کھال میں رہے ورنہ اس کا وہی حال ہو گا جو میرا ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر کلیلہ چپ ہو گیا اور ایسا چپ ہوا کہ ساری رات گذر گئی مگر نہ اس نے دمنہ کو کوئی نصیحت کی نہ کوئی حکایت سنائی۔

کلیلہ دمنہ ہٹ لسٹ پر

چترانی لومڑی کو کنسوئیاں لینے کی بہت عادت تھی۔ ایک شام وہ کلیلہ دمنہ کے بھٹ کی طرف سے گذری۔ گذرتے گذرتے اسے ان دونوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ سوچا کہ سنوں تو سہی یہ دونوں یار کیا باتیں کر رہے ہیں۔ بس وہ بھٹ کے کنارے کان لگا کر بیٹھ گئی۔

دمنہ کلیلہ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گیدڑوں کی نئی نسل اپنے باپ دادا کی طرح جاہل نہیں ہے۔ گیدڑ بچے پڑھ لکھ کر جوان ہوئے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں انہوں نے ماشاء اللہ اتنی دسترس حاصل کی ہے کہ آئن سٹائن کے کان کاٹتے ہیں۔

چترانی کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ دوڑی دوڑی اپنی برادری میں گئی۔ اسے سخت بوکھلایا ہوا دیکھ کر برادری کی ساری لومڑیاں اس کے گرد جمع ہو گئیں اور پوچھنے لگیں کہ "خیر تو ہے کیا ہوا۔"

"کیا بتاؤں بیبیو۔ ہماری نکھٹو اولاد نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔"

اس پر لومڑیوں کو اور کرید ہوئی۔ اس پر سوالوں کی بھرمار کر دی۔ مگر چترانی

صاف صاف کچھ نہیں بتا رہی تھی۔

ایک بوڑھی لومڑی نے جو لمڑی بو کہلاتی تھی اسے آڑے ہاتھوں لیا "اری کمبخت تو یہ کیا پہیلیاں بوجھوا رہی ہے۔ کچھ منہ سے پھوٹ کہ بات کیا ہے۔"

تب وہ کھلی اور کہنے لگی "میں ابھی کلیلہ دمنہ کی باتیں سن کر آئی ہوں۔ وہ اس پر خوش ہو رہے تھے کہ گیدڑوں کی اولاد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اب وہ اعلیٰ عہدے حاصل کریں گے اور گیدڑوں کے دلدر دور ہو جائیں گے۔ لمڑی بو' یہ سن کر میں نے سر پیٹ لیا کہ گیدڑ ترقی کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی اولاد کی تعلیم پر توجہ ہی نہیں دی۔ اب لومڑیاں گیدڑوں کی چاکری کریں گی۔"

لومڑیاں یہ سن کر سخت پریشان ہوئیں۔ چترانی صحیح کہہ رہی ہے۔ گیدڑ اب اعلیٰ تعلیم کے زور پر اعلیٰ مراتب حاصل کریں گے۔ اور لومڑیوں کا شمار اب پسماندہ طبقوں میں ہو گا۔

ایک گھاگھ لومڑیوں کی یہ بوکھلاہٹ دیکھ کر ہنسا اور بولا "نادان لومڑیو! کیا تم نے یہ مثل نہیں سنی کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ بس یہی کچھ ہوا ہے۔ گیدڑ بچوں نے شہر کا رخ کیا اور کالجوں میں جا کے سائنس اور فلسفہ پڑھنے لگے۔ سمجھو کہ چیونٹی کے پر نکل آئے۔ تم نے ان برہمن بچوں کا قصہ تو سنا ہو گا جنہوں نے مرے ہوئے شیر میں جان ڈال دی تھی۔"

"نہیں وہ کیا قصہ ہے۔"

"اچھا وہ قصہ تم نے نہیں سنا۔ تو لو سنو۔" اور اس نے یہ قصہ اس طرح سنایا۔

ایک پاٹھ شالا میں چار برہمن بچے پڑھتے تھے۔ آپس میں ان میں بہت یاری تھی۔ آگے چل کر ان میں سے تین تو بہت ددھوان بن گئے۔ شاستروں اور ویدوں کو تو انہوں نے گھوٹ کر پی رکھا تھا۔ مگر عقل سے پیدل تھے۔ چوتھا علم کے معاملہ میں تو

بہت کچا تھا۔ مگر تھا ہوشیار اور عقلمند۔ ایک دفعہ یہ چاروں مل کر ایک سفر پہ نکلے۔ رستے میں چلتے چلتے انہوں نے دیکھا کہ ایک شیر مرا پڑا ہے۔ سارا گوشت گل گیا تھا۔ بس ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ تینوں ودھوانوں کو شوق ہوا کہ انہوں نے جو مُردوں میں جان ڈالنے کی ودیا حاصل کی ہے اسے یہاں آزمایا جائے۔ چوتھے دوست نے جو علم میں کچّا تھا مگر عقل رکھتا تھا انہیں سمجھایا کہ ایسا مت کرو۔ اگر یہ شیر جی اٹھا تو ہم چاروں کو کچا چبا جائے گا۔ مگر وہ تو اپنے علم کے زعم میں تھے۔ چوتھے دوست کو وہ جاہل سمجھتے تھے۔ اس کے مشورے پر انہوں نے ذرا کان نہیں دھرا۔ چوتھے نے کہا کہ "اچھا تم یہ خطرہ مول لینے پہ تل گئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مگر پہلے مجھے ذرا درخت پہ چڑھ جانے دو۔"

بس وہ فوراً ہی لپک کر پاس کے ایک درخت پہ چڑھ گیا۔ ادھر ان تینوں نے اپنی ودیا سے اس ڈھانچے پر پڑھنا پھونکنا شروع کیا۔ اے لو، وہ شیر تو واقعی جی اٹھا۔ بھوکا تو تھا ہی، سامنے شکار دیکھ کر خوش ہوا اور غرّایا۔ بس ان پہ جھپٹ پڑا اور تینوں کو بھنبھوڑ کھایا۔

جب شیر کھا پی کر وہاں سے رخصت ہو گیا تو چوتھا دوست اطمینان سے درخت سے اترا اور گھر کی راہ لی۔

گھاگھ لومڑ نے یہ قصہ سنانے کے بعد کہا کہ "اے لومڑیو، اس قصے سے تم کیا سمجھیں۔ اصل چیز عقل ہے علم نہیں۔ عالم کے پاس عقل نہ ہو تو علم الٹا پڑ جاتا ہے۔ فائدے کی بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔ اور تمہیں یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ ہم جانوروں کی برادری میں سب سے بے عقل جانور دو ہیں۔ اول گدھا، دوم گیدڑ۔ گدھے کی پیٹھ پہ اگر کتابیں لاد دی جائیں تو وہ کیا عالم بن جائے گا۔ اور کلیلہ گلستان بوستان پڑھ لے تو کیا وہ شیخ سعدی بن جائے گا۔ گیدڑوں کو علم کا سودا مہنگا پڑے گا۔ ان کا وہی انجام ہو گا جو ان ودھوان برہمن بچوں کا ہوا تھا۔ عقل تو سب جانوروں سے بڑھ کر لومڑی کے پاس

ہے۔اسے کیاجو کھوں ہے۔"

یہ سن کر سب لومڑیوں نے اطمینان کا سانس لیااور خوش خوش اپنے بھٹوں میں واپس چلی گئیں۔ مگر چترانی مطمئن نہیں ہوئی۔ گھاگھ لومڑ کے استدلال سے وہ کچھ زیادہ قائل نہیں ہو سکی۔ وہ اس ٹوہ میں رہنے لگی کہ اب گیدڑوں کے کیا منصوبے ہیں۔ آخر ایک دن موقع پاکر پھر اس نے کلیلہ دمنہ کی باتیں سن لیں۔ وہاں سے اسے پتہ چلا کہ ایک گیدڑ بچے نے پڑوس کے جنگل میں جاکر اپنی علمی قابلیت کالوہامنوایااور شیر بادشاہ کا وزیر بن گیا۔ وہ گھبرائی ہوئی اپنی برادری میں آئی اور لومڑیوں کو یہ خبر سنائی۔ کہنے لگی کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو کوئی گیدڑ بچہ اپنے پڑھے لکھے ہونے کا رعب ڈال کر یہاں بھی وزیر بن سکتا ہے۔ بس پھر تو اس جنگل میں گیدڑ ہی دندنائیں گے اور لومڑیاں گھاس کاٹیں گی۔

پھر اس نے سوچا کہ خالی لومڑیوں کے بھروسے پہ نہیں رہنا چاہیے۔ انہوں نے پہلے کیا کیا تھا جو اب کچھ کریں گی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھی بھیڑیوں کی طرف گئی۔ ادھر بھیڑیے پہلے ہی گیدڑ بچوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر دانت پیس رہے تھے۔ چترانی کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

چترانی اور بھیڑیوں میں جو مسکوٹ ہوئی اور جو پروگرام بنے اس کی خبر دمنہ کو بھی پہنچ گئی۔ اس خبر نے اسے ایک نئی تشویش میں مبتلا کر دیا۔

دمنہ اس روز جب جنگل کی خاک چھان کر واپس بھٹ میں آیا تو بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ نہ اغیار کے چھل فریب کی باتیں نہ اپنی فتوحات کا تذکرہ۔ زبان میں جیسے تالا لگ گیا ہو۔ کلیلہ نے اسے غور سے دیکھااور فکر مند ہو کر پوچھا کہ "اے دمنہ' آج تو اتنا چپ چپ کیوں ہے۔ خیر تو ہے۔"

دمنہ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "اے کلیلہ 'بہت برا زمانہ آگیا ہے۔"

کلیلہ طنزیہ ہنسی ہنسا اور بولا "تجھے اب پتہ چلا ہے۔" پھر فوراً ہی لہجہ میں سنجیدگی آگئی "اے مرے یار، زمانہ برا کب نہیں تھا۔ ہم نے تو جب سے آنکھ کھولی ہے زمانے کو برا ہی پایا ہے۔"

"اے کلیلہ جو تو نے دیکھا بھول جا اس وقت سے ڈر جو آنے والا ہے بلکہ آچکا ہے۔ ظالموں جاہلوں کی بن آئی ہے۔ عاقلوں دانشمندوں پر یہ وقت بھاری ہے۔ گھڑی گھڑی کی خیر مانگ۔ مجھے اب اس جنگل میں کسی عاقل، کسی سمجھدار، کسی روشن خیال کا سر سلامت نظر نہیں آتا۔"

کلیلہ نے یہ سن کر تامل کیا۔ پھر اداس بھرے لہجے میں بولا "یہ وقت نہ آتا تو مجھے تعجب ہوتا۔ آگیا ہے تو کوئی تعجب نہیں۔ اس پر میں بقول مرزا سودا یہی کہہ سکتا ہوں کہ ع

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

مگر صاف صاف بتا کہ تو نے کیا دیکھا کہ آج تو ایسی مایوسی کی باتیں کر رہا ہے۔"

تب دمنہ نے یوں کلام کیا کہ "اے کلیلہ میں تجھ سے یہ ذکر کر چکا ہوں کہ ہماری نوجوان نسل میں نئے خیالات تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ مگر اس جنگل میں جانوروں کی عام خلقت تو اب بھی پہلے کی طرح حیوان ہے۔ عقل کی کوئی بات ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ مینا اور بندر کا قصہ تو تو نے سنا ہوگا۔"

"وہ کیا قصہ ہے۔"

"وہ قصہ اس طرح ہے کہ اسی جنگل میں ایک درخت کی کھکھل میں ایک مینا نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ جب مینہ پڑا تو وہ اطمینان سے اپنے بچوں کو لے کر گھونسلے میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک بندر بھیگتا ہوا چھلانگیں لگاتا اسی شاخ پر گھونسلے کے

قریب آن بیٹھا۔ بارش موسلادھار ہو رہی تھی اور وہ بری طرح بھیگ رہا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مینا کو یہ دیکھ کر اس پر ترس آیا اور ہمدردی کا یہ بول زبان پر لائی کہ "اے بندر' اگر تو نے بھی کسی درخت کی کھکھل میں پہلے سے اپنا ٹھکانا بنالیا ہوتا تو اس پریشانی سے بچ جاتا۔ بہر حال ابھی تو برسات کا شروع ہے۔ تو ایسا کوئی انتظام کر لے تو اچھا ہو۔"

بندر بارش سے ویسے ہی پریشان تھا۔ مینا کی اس بات پر اور چڑ گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ' مینا کے گھونسلے کو کھسوٹ ڈالا۔ بیچاری مینا بندر کو عقل کی بات بتا کر بہت پچھتائی۔

اس پر کلیلہ بولا کہ "بندر کی جہالت کا کوئی جواب نہیں عقل کی بات تو اس کی بدھی میں آتی ہی نہیں۔"

دمنہ نے اس پر کہا کہ "اس جنگل میں بندر سے بھی زیادہ جاہل اور وحشی جانور بسے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑھ کر بھیڑیئے ہیں کہ کل بھی بھیڑیئے تھے آج بھی بالکل بھیڑیئے ہیں۔ سخت رجعت پسند' انسانیت دشمن' تنگ نظر۔ ایک تو جہالت۔ اس پر درندگی مستزاد۔ ہماری نئی نسل کے لبرل خیالات نے سب سے زیادہ انہیں کو مشتعل کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ہمارے جنگل کے قانون کے خلاف سازش ہے۔ لومڑی کو تو ہم تم جانتے ہی ہیں کہ یہ تو ہوا کا رخ دیکھتی ہے۔ تو کچھ لومڑیاں بھی ان کے ساتھ مل گئی ہیں۔ پھر کوئی بندر' کوئی لکڑ بھگا ان سب نے مل کر اپنی ایک تنظیم بنالی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس تنظیم کی صورت میں ایک نیا خوفناک درندہ ہمارے جنگل میں نمودار ہوا ہے۔ اس کا نعرہ یہ ہے کہ جو جانور جنگل کے قانون سے روگردانی کرتا ہے اس کی گردن ماردو۔ اور اس کے حساب سے ہر وہ شخص جو نئی سوچ رکھتا ہے اور درندگی پر دانشمندی کو ترجیح دیتا ہے وہ جنگل کے قانون سے روگردانی کا مرتکب ہے۔"

کلیلہ دمنہ کا یہ کلام سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "یہ جو تمہارا شیر جنگل کا

بادشاہ بنا بیٹھا ہے وہ کیا کہتا ہے۔"

"اس کی مت پوچھو۔" دمنہ نے بیزاری سے کہا "اسے شیر کون کہتا ہے۔ وہ تو مٹی کا مادھو ہے۔ کانوں کا ایسا کچا کہ مصاحبوں نے جو کانوں میں پرو دیا اسے آنکھیں بند کر کے مان لیا۔ اور جس بادشاہ کے مصاحبوں میں بھیڑیئے اور لومڑیاں ممتاز ہوں اس بادشاہ سے انصاف کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے تو انہیں کا کہا حرف آخر ہو گا۔"

آخر دمنہ دربار کی کارروائی سے بے خبر تو نہیں تھا۔ اسے سب پتہ تھا کہ وہاں کیا سازش ہوئی اور کس نے کیا کردار ادا کیا۔ اصل یں ہوا یوں کہ جب تنظیم بن گئی اور کھر نکھر بھیڑیا اس کا کمانڈر مقرر ہو گیا تو چترائی نے ایک سوال اٹھایا۔ اس نے کہا کہ "ہمیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ شیر کا اس بارے میں کیا ردعمل ہو گا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ ہمارے منصوبے میں کھنڈت ڈال دے۔"

کھر نکھر نے سوچ کر کہا کہ "ویسے تو ہم جو کچھ کر رہے ہیں جنگل اور جنگل کے بادشاہ کے مفاد ہی میں کر رہے ہیں۔ مگر ہمیں شیر کو اس ساری صورت حال سے باخبر کر دینا چاہیے۔"

دوسرے دن کھر نکھر نے دربار میں موقع پا کر اپنی بات شیر بادشاہ کے گوش گذار کر دی۔ کہا کہ "جہاں پناہ' جنگل میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا ہے جس سے جنگل کے امن اور تخت کی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔"

"وہ کیا فتنہ ہے۔" شیر نے تعجب سے پوچھا۔

"حضور والا' چند سر پھرے گیدڑوں نے جوش جوانی میں سر اٹھایا ہے۔ انہوں نے فلسفہ اور سائنس کے چار حرف کیا پڑھ لیے کہ اپنے آپ کو عاقل سمجھنے لگے ہیں۔ جنگل کے قانون پر حرف گیری کرتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے

باغیانہ خیالات کی بو آتی ہے اور جن میں کفر والحاد کا رنگ ہے۔"

اس پر شیر کے تیور بدلنے لگے۔

چترانی نے فوراً لقمہ لگایا "جہاں پناہ' انہوں نے ساتھ میں یہ بھی پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے کہ گیدڑ حسب نسب کے اعتبار سے شیروں کے ہم پلہ ہیں۔"

شیر غرایا اور بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

لومڑی نے کہا کہ "آپ نے شیرنی اور گیدڑ بچہ کا قصہ تو سنا ہو گا۔"

"وہ کیا قصہ ہے۔"

"اچھا' آپ نے وہ قصہ نہیں سنا۔ گیدڑ تو آج کل یہ قصہ سب کو سناتے پھر رہے ہیں۔ یہ قصہ اس طرح ہے۔" اور لومڑی نے یہ قصہ اس طرح سنایا۔

قریب کے کسی جنگل میں ایک دن ایک شیر شکار کے لیے نکلا۔ اسے دیکھ کر جنگل کے جانوروں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ ان کی جھپیٹ میں آکر گیدڑ کا ایک بچہ زخمی ہو کر بلبلانے لگا۔ شیر کو اس پر ترس آیا۔ اسے منہ میں دابا اور اپنی کچھار میں لے آیا۔ شیرنی اسے دیکھ کر غرائی اور کہا کہ "شکار تو لائے نہیں۔ اس مریل گیدڑ بچہ کو کہاں سے اٹھا لائے ہو۔"

لیکن جب شیر نے اس کی حالت زار کی طرف توجہ دلائی شیرنی کا دل بھی آخر موم ہو گیا۔ ترس کھا کر کہنے لگی "جانے کس غریب ماں کا بچہ ہے۔ کمبخت نے جنگل میں اسے اکیلا چھوڑ دیا۔"

پھر تو اسے اس بچہ سے ایسی ہمدردی ہوئی کہ اپنے بچوں کے ساتھ اسے بھی دودھ پلانا شروع کر دیا۔ بس پھر یہ گیدڑ بچہ شیرنی کی گود میں اس کے بچوں کے ساتھ پل کر بڑا ہوا۔ جب وہ شکار کو جاتے تو یہ بھی ان کے ساتھ ہو لیتا۔ ایک دفعہ وہ ایک نیل گائے پہ جھپٹ پڑے۔ وہ تو مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ آخر شیر کے بچے تھے۔ گیدڑ بچہ سہم

کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس پر بعد میں ان شیر بچوں نے اس کا بہت مذاق اڑایا۔ وہ بیچارہ روہانسا ہو گیا۔ اس پر شیرنی نے انہیں ڈانٹا اور کہا کہ جیسے تم نے میرا دودھ پیا ہے ویسے ہی اس نے بھی پیا ہے۔ تم میں اس میں آخر فرق کیا ہے۔ خبردار جو آئندہ کبھی اس کا مذاق اڑایا۔ اسے بھائی سمجھ کر اپنی طرح شکار کرنا سکھاؤ۔

لومڑی نے یہ قصہ سنا کہ کہا کہ "عجب ہے کہ یہ احسان فراموش گیدڑ اس شیرنی کا احسان ماننے کی بجائے اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ شیروں اور گیدڑوں میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے۔ جیسے شیر ویسے گیدڑ۔"

اس پر کھر نکھر نے یہ ٹکڑا لگایا "اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جنگل کا بادشاہ اگر شیر ہو سکتا ہے تو گیدڑ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔"

چترانی لومڑی نے اس مضمون کو آگے بڑھایا اور کہا "جس گیدڑ نے اپنے شیر بادشاہ کو موت کے منہ میں ڈھکیلا تھا اس کے دماغ میں بھی شاید اسی قسم کا خناس سمایا تھا۔"

شیر نے سوالیہ نظروں سے چترانی کو دیکھا اور پوچھا "وہ گیدڑ کون نانہجار تھا اور اس نے کس طرح شیر کو موت کے منہ میں دھکیلا۔"

"اچھا جہاں پناہ نے یہ قصہ نہیں سنا۔" اور پھر اس نے یہ قصہ اس طرح سنایا۔

یہیں کہیں ایک جنگل میں ایک گیدڑ شیر بادشاہ کا مصاحب بنا ہوا تھا۔ ویسے تو وہ بادشاہ کا بہت وفادار بنتا تھا۔ مگر دل میں اس کے کچھ اور تھا۔ سوچا کرتا کہ کسی ترکیب سے اس ظالم بادشاہ سے نجات حاصل کی جائے۔ بس اسی میں ایک عجیب ترکیب اس کے سازشی ذہن میں آئی۔ دربار میں پہنچ کر دست بستہ عرض کی کہ "جہاں پناہ' میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔ یہ آپ کا نمک خوار

آپ کے یہ گوش گذار کرنا چاہتا ہے کہ اس جنگل میں کہیں سے ایک اور شیر آن دھمکا ہے۔ اس کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اس نے اپنا دربار لگانا شروع کر دیا ہے۔"

شیر کو اس خبر پر تشویش ہوئی۔ غصہ بھی آیا۔ گرج کر پوچھا "ہمارے دربار کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ وہ یہاں اپنا دربار لگائے۔ یہ شیر ہے کہاں۔"

مصاحب گیدڑ نے مودبانہ کہا "میں نے اس کا ٹھکانا معلوم کر لیا ہے۔ پچھم میں جو ایک بانسوں کا جھنڈ ہے۔ وہاں اس نے ٹھکانا بنایا ہے۔"

شیر غضب ناک ہو کر فوراً اس سے مقابلہ کے لیے چل کھڑا ہوا۔ گیدڑ اس کے ہمراہ چلا۔ جب بانسوں کے جھنڈ میں قدم رکھا تو گیدڑ نے ایک کنوئیں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ "اپنی حفاظت کے نقطۂ نظر سے اس نے کنوئیں میں اپنا ٹھکانا بنایا ہے۔"

شیر لپک کر کنوئیں کی من پہ چڑھ گیا اور کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں اسے اپنا عکس نظر آیا۔ اس عکس پر اسے اپنے حریف کا گمان ہوا۔ للکارنے کے انداز میں وہ دہاڑا۔ کنوئیں میں اس کی آواز جب گونجی تو وہ سمجھا کہ جواب میں حریف نے اسے للکارا ہے۔ اس پر اسے ایسا طیش آیا کہ پہلے سے زیادہ زور سے دہاڑا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔

گیدڑ خوش تھا کہ اس کی سازش کامیاب ہوئی۔ شیر کنوئیں سے کیسے نکلتا۔ وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

چترانی یہ قصہ سنا کر بولی "یہ ہے آج کل کے گیدڑوں کا حال۔"

شیر بادشاہ کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں۔ وہ غرایا اور بولا "ان گیدڑوں کی یہ مجال۔"

"ایسے باغیوں کا سر کچلنا چاہیے۔" کھرنکھر نے ٹکڑا لگایا۔

"تمہاری کیا تجویز ہے۔ کیسے اس فتنہ کا سدباب ہونا چاہیے۔" شیر نے پوچھا۔

کھرنکھر نے کہا کہ "سب سے پہلے تو ان سر پھرے نوجوان گیدڑوں کی سرکوبی ہونی چاہیے جو الٹی سیدھی کتابیں پڑھ کر اپنے آپ کو دانشور اور عاقل سمجھنے لگے ہیں۔"

شیر بادشاہ نے غصے میں حکم جاری کیا "جنگل میں جو گیدڑ دانشور نظر آئے، جو عاقل دکھائی دے اس کو پکڑو اور اس کی تکا بوٹی کر دو۔"

"جہاں پناہ کا حکم بجالایا جائے گا۔" کھرنکھر اور چترائی دونوں نے سر تسلیم خم کیا اور دربار سے نکل گئے۔

بس پھر کیا تھا، عاقلوں دانشوروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ لومڑیوں کی بن آئی۔ جس لومڑی کو جس جانور سے پرخاش تھی اس پر اس نے عاقل ہونے کا الزام لگایا اور پکڑوا دیا۔ سب سے بڑھ کر گیدڑ بچے زد میں آئے۔ اور صحیح آئے۔ اس جنگل میں نئے خیالات کا راگ پہلے تو انہوں ہی نے الاپا تھا۔ وہ ہی روشن خیالی کی مہم کا ہراول دستہ تھے۔ بھیڑیوں کو ایسا موقع خدا دے۔ لومڑیوں نے جس جانور پر عاقل ہونے کا ٹھپہ لگایا اسے انہوں نے پھاڑ کھایا۔ یوں جنگل دیکھتے دیکھتے بے گناہ جانوروں کا مقتل بن گیا۔

بہت پکڑ دھکڑ اور مار کاٹ کے بعد لومڑیاں اور بھیڑیئے سر جوڑ کر بیٹھے اور اپنی صفایا مہم کا جائزہ لیا۔ بھیڑیئے تو اپنی کارکردگی سے مطمئن ہی نظر آتے تھے۔ مگر چترائی کی ابھی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اس ساری مہم پہ تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "بھلا یہ کیا طریقہ ہے کہ اندھا دھند مارتے کاٹتے چلے جا رہے ہو۔ کتنے جانور مارے گئے۔ مگر جو فتنہ کی جڑ ہیں اور بس کی گانٹھ ہیں وہ اطمینان سے اپنے بھٹوں میں محفوظ بیٹھے ہیں۔"

"بھلا وہ کون ہیں۔ نام تو لو۔ "کھر نکھر نے چیلنج کے انداز میں پوچھا۔

"مثلاً "چترانی بولی "کلیلہ دمنہ۔"

اس پر سب کا ندامت سے سر جھک گیا۔

"میرے عزیزو "چترانی نے کہا "فتنہ کی جڑ تو یہی دونوں یار ہیں اور کلیلہ نے پنچ تنتر اور انوار سہیلی کیا پڑھ لی ہے کہ اپنے آپ کو مردِ دانا اور حکیم دوراں سمجھنے لگا ہے۔"

چترانی کی اس تقریر نے اپنا اثر دکھایا۔ طے ہوا کہ جو لوگ فتنہ کی جڑ ہیں ان کی ایک ہٹ لسٹ تیار کی جائے۔ چترانی کی سرکردگی میں یہ ہٹ لسٹ تیار ہوئی۔ اس ہٹ لسٹ میں کلیلہ اور دمنہ کے نام سب سے اوپر تھے۔

کلیلہ چپ ہو گیا

سمندر کنارے ایک گھنی بنی میں ایک پودنا پودنی رہتے تھے۔ آزادانہ بسر کرتے تھے۔ کبھی اس پیڑ پہ کبھی اس پیڑ پہ۔ شام پڑے جہاں جو پیڑ بھلا لگا اس پہ بسیرا کر لیا۔ مگر جب پودنی پیٹ سے ہوئی تو اس نے باتوں باتوں میں پودنے سے کہا کہ اب ہمارا کوئی گھونسلا ہونا چاہیے۔

پودنے نے لاپروائی سے کہا کہ "ہمارا کونسا ٹبر ہے جو ہم یہ جنجال پالیں۔"

پودنی نے شرماتے شرماتے کہا کہ "اب تم باپ بننے والے ہو۔ گھونسلا تو بنانا ہی پڑے گا۔"

پودنا یہ خبر سن کر خوش ہوا۔ پھر اس نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ایک جھاڑی اسے بھلی لگی۔ کہا کہ "اس جھاڑی میں گھونسلا بنالیں۔"

پودنی بولی "کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ جھاڑی تو بالکل سمندر کے کنارے پہ ہے۔ جب وہ امنڈے گا تو ہمارے گھونسلے کو بہالے جائے گا۔"

یہ سُن کر پودنا ہنسا اور بولا "جان من کیسی باتیں کرتی ہو۔ مجھے تم نے کوئی ایرا غیرا سمجھا ہے۔ میں پودنا ہوں۔ اس جنگل میں میری بہت دھاک ہے۔ سمندر کی کیا

مجال ہے کہ وہ ہمارے گھونسلے کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے۔ آنکھیں نہ نکال لوں گا اس کی۔"

اس بیان سے پودنی کو بہت ڈھارس ہوئی۔ اس نے تنکا تنکا جوڑ کر جلد ہی اس جھاڑی میں ایک اچھا سا گھونسلا بنالیا۔ پھر انڈے دے کر اطمینان سے ان پر بیٹھ گئی۔"

اب سمندر کی سنو۔ اس نے کہیں پودنے کی بات سن لی۔ وہ اپنے زعم میں تھا۔ دل میں کہا کہ یہ پودنا چہ پدی چہ پدی کا شوربہ میرے منہ آتا ہے۔ اس کی ساری شیخی نکال دوں گا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ پودنا پودنی دونوں دانے دنکے کی فکر میں کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ وہ تاؤ کھا کر امنڈا اور گھونسلے کو بہا کر لے گیا۔

جب پودنا پودنی گھوم پھر کر واپس آئے تو دیکھا کہ سمندر لہریں لے رہا ہے اور ان کا گھونسلا غائب ہے۔ پودنی پہ تو جیسے بجلی گر پڑی۔ "ہائے میرے انڈے۔" اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ پھر اس نے طعن بھری نظروں سے پودنے کو دیکھا "تم تو بہت اکڑ میں تھے کہ سمندر آنکھ بھر کر ہمارے گھونسلے کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تمہارا رعب داب کہاں گیا۔"

پودنے کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بولا "اس سمندر کی اوقات کیا ہے۔ ابھی اس کی مزاج پرسی کرتا ہوں۔ بچو کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

"ارے جاؤ۔ رہنے دو۔ اپنے جثّے کو دیکھو اور سمندر کو دیکھو۔ چلے ہیں ہاتھیوں سے گنے کھانے۔"

پودنا اس پہ اور بھنایا اور بولا "تم کیسی بے عقلی کی باتیں کر رہی ہو۔ سوچو کہ جب بجلی پہاڑ پہ گرتی ہے تو وہ پہاڑ کا پہاڑ اور بجلی کتنی سی ہوتی ہے۔ تو میرے جثّے پہ مت جاؤ۔ میری چونچ کو دیکھو۔ سمندر کو پی جاؤں گا اور ڈکار نہیں لوں گا۔"

"ارے چھوڑو یہ خوجی والی باتیں۔" پودنی بولی "اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو وہ

کرو جو پدی نے کیا تھا۔"

"بھلا پدی نے کیا کیا تھا۔" پودنے نے تجسّس کے ساتھ پوچھا تب پودنی نے اسے پدی کا قصہ سنایا۔

ایک جنگل میں کسی درخت پر ایک پدی پدے نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ ایک دن اس طرف سے ایک مست ہاتھی گذرا۔ اس ہرے بھرے درخت کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ بس ترنت ہی اس نے اپنی سونڈھ بلند کی اور اس کی شاخیں توڑ توڑ کر انہیں کھانا شروع کر دیا۔ جس شاخ پہ پدی پدے کا گھونسلا تھا وہ شاخ بھی سونڈھ کی زد میں آ گئی۔ پدی نے انڈے دے رکھے تھے۔ گھونسلا بھی گیا' انڈے بھی ٹوٹ گئے۔ اس بیچاری کا دل ٹوٹ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایک کھٹ بڑھئی نے اسے روتے دیکھا تو اس کا دل پسیج گیا۔ وہ اس کے پاس آن بیٹھی اور لگی اسے سمجھانے "پدی میری جان' کیوں رو رو کے جی ہلکان کر رہی ہے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اللہ کی مرضی میں ہم ہدیوں کھٹ بڑھیوں کا کیا دخل ہے۔ جی کو سنبھال اور اس غم کو بھولنے کی کوشش کر۔"

"میری کوکھ اجڑ گئی۔ کیسے بھول جاؤں اس غم کو۔" پھر روتے روتے اسے غصہ آیا "اس کمبخت ہاتھی پہ قہر ٹوٹے۔ اس نے میری کوکھ اجاڑی ہے۔ اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میرا بھی نام اگر پدی ہے تو میں اسے ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ اولاد سے کہہ مرے گا کہ سب کچھ کریو کسی پدی سے ٹکر مت لیجیو۔" پھر رک کر بولی "بی بی اگر تم میں ہمدردی کا کوئی مادہ ہے تو کچھ میری مدد کرو۔ میں تو اس ہاتھی سے بدلہ لے کے چھوڑوں گی۔"

کھٹ بڑھیا نے کہا "پدی میری جان۔ دوست وہی ہے جو مصیبت میں ساتھ دے۔ میں تیرا ضرور ساتھ دوں گی۔ بس اب تو اپنے آنسو پونچھ لے اور ذرا ٹھنڈے

دل سے غور کر کہ بدلہ کیسے لیا جائے۔ ایک مکھی کہ ویزوا اس کا نام ہے میری سہیلی ہے۔ میں اس سے جا کر بات کرتی ہوں۔ وہ مدد کے لیے تیار ہو گئی تو پھر ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ تو چل اٹھ میرے ساتھ ویزوا کے پاس چل۔"

وہ دونوں مل کر ویزوا کے پاس گئیں۔ ہاتھی نے جو کچھ کیا تھا وہ بیان کیا اور کہا کہ "ہمیں اس کلموئے سے بدلہ لینا ہے۔ بتاؤ، تم ہماری مدد کرو گی۔"

ویزوا بولی "کھٹ بڑھیا کے ساتھ تو میری دانت کاٹی روٹی ہے۔ وہ کہے اور میں مدد نہ کروں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس ہتھیارے ہاتھی کو تو میں ناک چنے چبوا دوں گی۔ مگر میرا ایک یار ہے۔ میگھ ناد مینڈک۔ اس سے میں مشورہ کروں گی۔ اگر اس نے ساتھ دینے کی حامی بھر لی تو سمجھ لو کہ بیڑا پار ہے۔ تم بھی چلو میرے ساتھ۔

سوپدی، کھٹ بڑھیا اور مکھی مل کر میگھ ناد مینڈک کے پاس پہنچے۔ سارا قصہ اسے بتایا۔ پھر ویزوا مکھی نے کہا "کہو میگھ ناد اب تم کیا کہتے ہو۔"

میگھ ناد بولا کہ "ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ تم نے ہاتھی سے لڑنے کی ٹھانی ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر چال بھی تو بتاؤ جس کے تم ماہر ہو۔" ویزوا نے پوچھا۔

"ہاں بتاتا ہوں۔ ویزوا، تو ایسا کر کہ عین دوپہر کے وقت تو اس کے کان کے پاس جا کر بھنبھنانا شروع کر دے۔ اور یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تیری بھنبھناہٹ تو وینا کا اثر رکھتی ہے۔ اس سے اس پر ایسی کیفیت طاری ہو گی کہ اس پر غنودگی طاری ہو جائے گی۔ اس کے بعد کام شروع ہوتا ہے کھٹ بڑھیا کا۔ تو اے کھٹ بڑھیا جب ہاتھی پر غنودگی طاری ہو جائے تو تو اپنی اس لمبی نوکیلی چونچ کو اس کی آنکھوں میں گھونپ دے۔ وہ اندھا ہو جائے گا۔ پھر میں اپنا کام دکھاؤں گا۔ میں اس گہرے کھڈ کے کنارے بیٹھ کر جو قریب ہی ہے ٹرانا شروع کر دوں گا۔ ہاتھی سمجھے گا کہ تالاب سے مینڈک کی آواز آ رہی ہے۔ وہ

اس طرف آئے گا اور کھڈ میں گر پڑے گا۔"

میگھ ناد کی حکمت عملی پر جب اتفاق رائے ہو گیا تو فوراً ہی اس پر کام شروع ہو گیا۔ ہاتھی اندھا ہو کر گڑھے میں اوندھے منہ گرا اور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

یہ قصہ سنانے کے بعد پودنی نے کہا کہ "اے مرے سرتاج' مطلب یہ نکلا کہ خالی طاقت سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور خالی نعرہ بازی میں بھی کچھ نہیں رکھا۔ جنگ میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ صفوں میں مکمل اتحاد ہو اور کوئی جنگی حکمت عملی ہو۔ پدی، مکھی، کھٹ بڑھیا اور مینڈک نے جب متحدہ محاذ بنالیا اور مینڈک جیسا جنگی حکمت عملی کا ماہر ان کا رفیق بن گیا تو وہ اندھی طاقت جسے ہاتھی کہتے ہیں کچی دیوار کی طرح ڈھے گئی۔"

پودنے نے اپنی رفیقۂ حیات کا یہ کلام سن کر ایسے جھرجھری لی جیسے قومیں خواب غفلت سے بیدار ہوتی ہیں۔ اب اس نے جوش کی جگہ ہوش سے کام لینے کی ٹھانی۔ اس کی ہوش مندی اور اس کے سیاسی تدبر سے یہ ذاتی المیہ ایک قومی تحریک کا پیش خیمہ بن گیا۔ پرندوں میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب ان کا ایک ہی نعرہ تھا کہ دنیا کے مظلوم پنچھیو ایک ہو جاؤ۔

تحریک نے رفتہ رفتہ زور پکڑا۔ پھر ایک کانفرنس ہوئی جس میں پرندوں نے رنگ و نسل کے اختلافات کو بھلا کر ایک متحدہ لائحہ عمل طے کرنے کی کوشش کی۔ جب بہت تقریریں ہو چکیں تو سارس نے چونچ کھولی اور یوں بولا کہ اے میرے عزیز پنچھیو' بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والو۔ تم بہت اونچا اڑے۔ مگر میں یہ کہوں گا کہ اتنا اونچا مت اڑو کہ زمینی حقائق نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ زمینی حقائق کیا ہیں۔ میری چونچ کو دیکھو جو تم سب کی چونچوں سے لمبی ہے۔ مگر یہ لمبی چونچ سمندر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

مگر سارس اپنی تقریر ختم نہیں کر سکا۔ اس کے خلاف نعرے لگنے لگے۔ فوراً

ہی سمندری ایجنٹ ہونے کا الزام جڑ دیا گیا۔

مگر مور نے حالات کو سنبھالا۔ بڑی متانت سے تقریر کی اور کہا کہ ہم کمزور ضرور ہیں لیکن قنوطیت تو مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ کمزور بھی متحد ہو کر بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ اور ابھی تو اس تحریک میں سارے پرندے شامل ہی نہیں ہیں۔ ہم کمزوروں میں کچھ طاقتور بھی تو ہیں وہ کہاں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ گرڑ کہاں ہے۔ اسے اس تحریک میں شرکت کی دعوت کیوں نہیں دی گئی۔

اس پر سارے پرندے چونک پڑے۔ گرڑ کی طاقت کا لوہا تو دنیا مانتی تھی۔ اسے کیوں نہیں بلایا گیا۔ بس پھر فوراً ہی چند نمائندے چنے گئے جنہوں نے گرڑ کے پاس جا کر تحریک کے اغراض و مقاصد بتائے اور اجلاس میں لے کر آئے۔ اور ابھی بحث گرم تھی اور سمندر کے خلاف جذبات کا سیلاب امنڈ رہا تھا کہ وشنو جی کا ہرکارہ آن پہنچا۔ گرڑ کو اس نے پیغام دیا کہ مہاراج وشنو جی ایک لمبی یاترا پہ چلنے لگے ہیں تمہیں بلایا ہے۔

گرڑ غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ ٹکا سا جواب دیا کہ اس سمے میری جاتی مشکل میں گھری ہے۔ میں نہیں آسکوں گا۔

اس پر گرڑ مہاراج زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ اور پھر اچانک کوے نے ایک قرارداد پیش کی کہ جو پرندے دیوتاؤں کی سواریاں بنے ہوئے ہیں وہ سب مل کر ستیہ گرہ کریں اور سواری بننے سے انکار کر دیں۔

ایک دم سب کی نظریں مور اور راج ہنس کی طرف اٹھ گئیں۔ مگر انہوں نے فوراً ہی اٹھ کر اس تجویز کی تائید کر دی۔

ہرکارے نے یہ رنگ دیکھا تو فوراً واپس گیا اور وشنو جی کو رپورٹ دی کہ وہاں تو پنچھیوں نے پہیہ جام ہڑتال کر دی ہے۔

"پہیہ جام ہڑتال۔ یہ کیا ہوتی ہے۔" وشنو جی نے اس پراچرج کیا اور فوراً ہی موقعۂ واردات پہ پہنچ گئے۔ گرڑ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہا کہ "مہاراج، سمندر تو آپ کا چاکر ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے وہ پنچھیوں پہ انیائے کر رہا ہے۔ بیچارے پودنے پودنی کے ساتھ اس نے کیا کیا۔ ان کا گھر اجاڑ دیا اور پودنی کی تو کوکھ اجاڑ دی۔"

وشنو جی نے پودنے پودنی کی بپتا سنی تو فوراً ہی کوڑا لے کے کھڑے ہو گئے۔ سمندر نے وشنو جی کے تیور دیکھے تو تھر تھر کانپنے لگا۔ فوراً گھونسلے کو دھو کے صاف کر کے اس کی جگہ رکھا اور انڈے پودنی کے حوالے کیے۔

یہ قصہ سنا کر دمنہ چپ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اداسی نے اسے آلیا۔ وہ تو چپ اور اداس بیٹھا تھا۔ مگر کلیلہ مسکرا رہا تھا۔ دمنہ نے اسے اداس نظروں سے دیکھا اور پوچھا "اے کلیلہ، بتا کہ تو مسکرایا کیوں۔"

کلیلہ نے جواب دیا کہ "اے دمنہ میں یہ دیکھ کر مسکرایا کہ تجھے نئے زمانے کی ایسی ہوا لگی ہے کہ پرانے قصہ کہانیوں میں بھی وہ نیا محاورہ جو تو نے نئے زمانے والوں سے سیکھا ہے ڈال دیتا ہے۔" رکا اور پھر بولا "اب تو بتا کہ آج تو اتنا چپ چپ اور اداس کیوں ہے۔"

دمنہ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "اے کلیلہ، اس کہانی نے مجھے اداس کر دیا۔ کیا بھلا زمانہ تھا کہ پدیوں اور پودنوں میں بھی اتنا دم خم تھا کہ ہاتھیوں سے ٹکرا جاتے تھے اور سمندروں کو خاک چٹا دیتے تھے۔ ایک ہمارا زمانہ ہے کہ جن کے سامنے ادب سے ہمارے سر جھک جاتے تھے وہ پودنے بن گئے ہیں۔ اور پدے اور پودنے شیر بنے پھرتے ہیں۔ رہ گئے گیدڑ لوگ تو ہر گیدڑ یہ سمجھتا ہے کہ ہمچو ماڈنگرے نیست۔ اے کلیلہ کچھ تیری سمجھ میں آتا ہے کہ یہ دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ ہمارے جنگل کا مستقبل کیا ہے اور ہم گیدڑوں کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔"

کلیلہ نے زہر خند کیا اور کہا کہ "اے دمنہ، یہ سب تیرے نئے زمانے کے کرامات ہے۔" پھر تامل کیا اور سنجیدگی سے بولا "پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے۔ اس زمانے میں پدی اپنی جگہ بھاری تھی، پودنا اپنی جگہ بھاری تھا۔ پدی پودنی پودنے چڑیا چڑے سب اپنی اپنی جگہ عزت دار تھے۔ اپنی اپنی آن رکھتے تھے۔ پدی کا اپنا ٹھسا تھا۔ پودنے کی اپنی آن تھی۔ مگر نئے زمانے نے زندگی کو تتر بتر کر دیا۔ جو کل تک پتھر کی مثال بھاری تھے اب گلی کے روڑے ہیں۔ جنگل کا قانون ختم ہو چکا ہے۔ بھیڑیوں اور آدم زادوں کی بن آئی ہے۔ جو وہ کہیں اور کریں اب وہی قانون ہے۔"

"پھر اے کلیلہ کسی کو تو بولنا چاہیے۔ اگر پدی آواز اٹھا سکتی تھی اور پودنا صدائے احتجاج بلند کر سکتا تھا تو کلیلہ کیوں نہیں بول سکتا۔"

کلیلہ اداسی سے ہنسا اور بولا "اے دمنہ وہ زمانہ اور تھا جب ہم بولتے تھے اور ہماری باتیں اور کہانیاں عرب و عجم تک سنی جاتی تھیں۔ اہل دانش کو ان میں حکمت کی رمزیں نظر آتی تھیں مگر وہ اہل دانش افسانہ بن گئے۔ اب شہر آدم زاد کے نعروں کی زد میں ہیں اور جنگلوں میں زاغ و زغن کا شور ہے۔ اس طوفانِ بد تمیزی میں کس کے پاس کان رہ گئے ہیں کہ وہ کلیلہ اور دمنہ سے کہانیاں سنے۔ سوائے دمنہ میں نے تجھے تیرے حال پہ چھوڑ دیا۔ تو جانے تیرا نیا زمانہ جانے۔ میں نے کہانیوں کا باب بند کر دیا اور میں چپ ہو گیا۔ اب میں اپنی خاموشی میں گم خود ایک کہانی ہوں۔ جو سنتا ہے اس کا بھی بھلا۔ جو نہیں سنتا اس کا بھی بھلا۔"

پھر کلیلہ چپ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور گم سم ہو گیا۔

چوہیا نے کیا کھویا کیا پایا

ویسے تو لگھو ٹپنک کاگا اس جنگل کی مشہور شخصیتوں میں سے تھا مگر ہیرانکی چوہیا نے کبھی کووں سے کوئی غرض ہی نہیں رکھی۔ سو لگھو ٹپنک سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس لیے جب اس نے اسے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دیتے دیکھا تو اسے تعجب ہوا کہ وہ یہاں کیا لینے آیا ہے۔ پہلے تو اس نے یہ سمجھا تھا کہ ہوگا کوئی ایرا غیرا۔ بہت بے مزہ ہوئی کہ بے وقت یہ کون بن بلایا مہمان آگیا۔ بل میں بیٹھے بیٹھے اس نے پکار کے پوچھا "کون ہے۔"

جواب آیا "میں لگھو ٹپنک ہوں۔"

لگھو ٹپنک۔ اچھا' وہ کالا کوا۔ کیوں آیا ہے یہاں۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ پھر وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ جانے کس نیت سے آیا ہے۔ مگر لگھو ٹپنک کسی بری نیت سے نہیں آیا تھا۔ علم کی طلب اور ہنر کی قدر دانی کا جذبہ اسے یہاں کھینچ کر لایا تھا۔ یہ تو اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ چوہیا ویدوں شاستروں میں بیری ہوئی ہے اور فلسفہ اور منطق میں طاق ہے۔ ایک واقعہ کے بعد وہ اس کے ہنر کا بھی قائل ہو گیا تھا۔ ہوا یوں کہ جس درخت پہ اس کا بسیرا تھا اس کی گھنی شاخوں میں فاختاؤں کی ایک

ٹکڑی نے بھی اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ایک دفعہ وہ ایک شکاری کے جال میں پھنس گئیں۔ کہیں ہیرانگی کو اس کی خبر لگ گئی۔ وہ تنت وقت پہ پہنچ گئی اور اتنے کمال سے جال کو کترا کہ شکاری کو اس کا پتہ ہی نہ چلا۔ اسے تو اس وقت پتہ چلا جب فاختائیں پھڑپھڑا کر کترے ہوئے جال سے نکل کر فضا میں بلند ہو گئیں۔ لگھوپتنک اس کے ہنر کا لوہا مان گیا۔ اور اس کوے کا یہ قول تھا کہ جہاں علم، حکمت اور ہنر نظر آئے وہاں سیس نواؤ اور فیض حاصل کرو۔ تو وہ اسی جذبے سے سرشار اس چوکھٹ پہ جا دھمکا۔

"اے کوے، آخر تو یہاں کیا لینے آیا ہے۔"

"علم کی بھیک۔"

یہ سن کر ہیرانگی ہنسی اور بولی "علم کی تلاش ہے تو کسی گیانی کسی ودھوان کے پاس جا۔ چوہیا کے بل میں تجھے علم کہاں ملے گا۔"

لگھوپتنک نے گڑگڑا کر کہا کہ "اے ہیرانگی، جو ودیا کا ساگر ہو اسے کنجوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس در سے خالی ہاتھ کیسے چلا جاؤں۔"

ہیرانگی نے اسے بہت جھڑکا ڈانٹا پھٹکارا۔ پھر بھی وہ وہاں سے نہ ٹلا تو وہ زچ ہو کر بولی کہ "اے لگھوپتنک ذرا سوچ کہ تو سیانا کوا، میں غریب مسکین چوہیا۔ دونوں کا ملاپ کیسے ہو۔ کبھی سانپ اور نیولے کی، کتے اور بلی کی، شکاری اور ہرن کی، ناستک اور بھگت کی، مورکھ اور گیانی کی دوستی ہوئی ہے۔"

مگر لگھوپتنک کو کوئی دلیل قائل نہ کر سکی۔ بس وہ مرن برت رکھ کر اس چوکھٹ پہ بیٹھ گیا۔ اس پہ وہ غریب چوہیا بہت سٹپٹائی۔ ایک دن تو جیسے تیسے گذر گیا۔ دوسرے دن جب کوے کی حالت بگڑی اور وہ ادھ مرا ہو گیا تو آخر اس کا دل پسیجا۔ بس دونوں آپس میں گھل مل گئے۔

لگھوپتنک نے ایک روز موقعہ پا کر حالات حاضرہ پر گفتگو کا آغاز کیا۔ تان

اس سوال پر ٹوٹی کہ "اے ہیرانگی دنیا کے حالات تو روز بروز خراب ہوتے ہی چلے جارہے ہیں۔ آخر ہم کدھر جارہے ہیں اور دنیا کا انجام کیا ہوگا۔"

ہیرانگی چپ رہی۔ پھر بولی "اے لکھوٹپنک کاگا' تجھے کس چنتا نے گھیرا ہے۔ تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کیا کام۔ میں چوہیا تو کاگا۔ ہماری کون سنتا ہے۔ آدمی کے دماغ میں یہ خناس ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ دنیا کا تھانیدار بنا ہوا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ جب دنیا کے کاروبار میں ہمارا کوئی عمل دخل ہی نہیں ہے اور ہماری سنی ہی نہیں جاتی تو بولنے کا فائدہ۔"

"بی بی تو ٹھیک کہتی ہے۔ اور کووں کی بات کو تو ہمیشہ کوے کی کائیں کائیں کہہ کر حقارت سے رد کیا گیا۔ مگر میں اپنے دل کو کیا کروں۔ دنیا کا جو حال ہو گیا ہے اور ہوتا چلا جارہا ہے اسے دیکھ کر دل تو کڑھتا ہے۔"

ہیرانگی نے یہ سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "اے لکھوٹپنک' آدمی مورکھ ہے۔ عقل کی بات کہو تو کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہے۔ یہی حال دیکھ کر تو میں نے اپنی زبان کو سی لیا اور اپنے بل میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی ایسا خفقان اٹھتا ہے کہ سوچتی ہوں جوگ لے لوں اور کسی ویرانے میں نکل جاؤں جہاں نہ کوئی آدم ہو نہ آدم زاد' نہ چوہا نہ چوہیا۔"

یہ سن کر لکھوٹپنک سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ہمت کر کے بولا "اے ہیرانگی' آدمی سے اگر تو مایوس ہے تو اس کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے مگر چوہوں اور چوہیوں سے تو کیوں مایوس ہوئی۔ اور میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آگے چوہیاں تیری بہت مالا جپتی تھیں۔ اب آس پاس کوئی چوہیا نظر نہیں آتی۔ آخر اس کا کارن کیا ہے۔"

ہیرانگی نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولی "مت پوچھ یہ بہت درد بھری کہانی ہے۔ بس اتنا جان لے کہ میں نے چوہوں اور آدمیوں دونوں کو پرکھ لیا ہے۔ دونوں کا احوال

ایک ساپایا۔

لکھوٹینک نے تامل کیا۔ پھر کہا"اے ہیرانگی 'یارِ غم گسار کو دل کا دکھڑا سنانے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔اچھا ہو کہ یہ درد بھری کہانی میں سن لوں۔ کچھ میں عبرت حاصل کروں۔ کچھ تیرا دل ہلکا ہو۔"

ہیرانگی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی "اچھا پھر سن۔" اور پھر وہ کہانی اس نے اس طرح سنائی۔

مورکھ پجاری سازشی سنیاسی

یہاں سے دو کوس دور ایک مندر ہے۔ میری سنگھی ساتھی چوہیاں سیل سپاٹے کی بہت شوقین تھیں۔ کبھی کبھی ہم سیر کرتے اس مندر میں جا نکلتے۔ کہیں ایک چوہیا نے تاڑ لیا کہ اس مندر کا پجاری اپنا بھوجن کہاں رکھتا ہے۔ اس چوہیا نے بتایا کہ رات کے کھانے سے جو بھوجن بچ جاتا ہے وہ اسے چھینکے پہ رکھ دیتا ہے۔

"اچھا یہ بات ہے۔" سب چوہیاں ایک دم سے بولیں "اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہماری طرف سے کھٹکا ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے۔" ایک چوہیا بولی "ورنہ چھینکے پہ کیوں رکھتا۔"

دوسری بولی "یہ تو پجاری کی بہت بری حرکت ہے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔"

میں چپ رہی۔ مگر ایک چوہیا نے مجھے ٹہوکا "اری ہیرانگی تو تو پھدکنے میں بہت ماہر ہے۔ کیا تو چھینکے تک نہیں پہنچ سکتی۔"

"کیوں نہیں پہنچ سکتی۔"

بس اسی رات ہم نے چھینکے پر دھاوا بولنے کی ٹھان لی۔ میں بڑی آسانی سے پھدک کر چھینکے پہ پہنچ گئی۔ جتنا ٹونگ سکتی تھی خود ٹونگا۔ باقی میں نے نیچے گرا دیا جسے سب چوہیوں نے مل کر مزے سے کھایا۔

بس پھر تو ہمارا روز کا یہی پروگرام ٹھہرا۔ پجاری پریشان کہ بھوجن چھینکے پہ رکھتا ہوں۔ چوہیاں وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔ پھر کیا کیا جائے۔

کہیں اس مندر میں ایک سنیاسی آنکلا۔ اس پجاری نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ اس کے لیے اچھا سا بھوجن تیار کیا۔ دونوں نے مل کر کھایا۔ مگر رات کو سنیاسی نے دیکھا کہ پجاری بہت بے آرام ہے۔ بار بار اٹھتا ہے اور ایک ڈنڈے سے پاس رکھی ہوئی پیتل کی تھالی کو بجاتا ہے۔

سنیاسی نے پجاری سے پوچھا کہ "آخر تو اتنا بے کل کیوں ہے۔ اور بار بار تھالی کیوں بجاتا ہے۔"

پجاری نے جواب دیا "سنیاسی جی کیا بتاؤں مجھے چوہیوں نے بہت ستایا ہے۔ میں بھوجن چھینکے پہ رکھتا ہوں۔ مگر اتنی اونچائی پر بھی وہ اچھل کر پہنچ جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

سنیاسی نے تھوڑی دیر سوچا۔ پھر کہا "دنیا میں ہر سمسیا کا حل موجود ہے۔ چوہیاں ایسی کونسی بڑی سمسیا ہیں۔ پجاری جی، کچھ تمہیں پتہ ہے کہ یہ چوہیاں کہاں سے آتی ہیں۔ ان کا بل کہاں ہے۔"

"وہ تو مجھے پتہ نہیں۔"

"اس کا پتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ بات یہ ہے پجاری جی کہ آدمی دھن دولت کے بل پہ کودتا ہے۔ چوہیا کا معاملہ بھی آدمیوں جیسا ہی ہے۔ جو چوہیا اتنا اونچا اچھلتی ہے کہ چھینکے پہ پہنچ جاتی ہے ضرور اس نے اپنے بل میں بہت دھن جمع کر رکھا ہے۔ اس کے بل پہ وہ اچھلتی کودتی ہے۔ ہمیں اس کے بل کا اتا پتہ کرنا چاہیے۔" یہ کہہ کے پوچھا کہ "تمہارے پاس کوئی پھاوڑا ہوگا۔"

"ہاں ہے۔"

"بس تو کل ہم ان چوہیوں کا پیچھا کریں گے۔ پھاوڑا ہمارے پاس ہو گا۔ بل کا کھوج لگ گیا تو اسے کھود ڈالیں گے۔ دیکھیں ان چوہیوں نے کو نسا دھن جمع کر رکھا ہے۔"

میں نے جب سنیاسی کی یہ بات سنی تو مجھے بہت چنتا ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ سنیاسی بہت چاتر بنتا ہے۔ میں بھی اسے ایسا جل دوں گی کہ یاد کرے گا۔ تو دوسرے دن جب سنیاسی اور پجاری ہمارے پیچھے پیچھے چلے تو میں نے چوہیوں کو ہدایت کی کہ آج سیدھے رستے نہیں چلنا۔ گلیوں میں ہوتے ہوئے گھوم پھر کے چلنا ہے۔ مگر ہوا کیا۔ ایک گلی میں ایک بلی ہم پہ جھپٹ پڑی۔ ایک چوہیا کو تو اس نے فوراً ہی دبوچ لیا۔ کئی چوہیاں زخمی ہو گئیں۔ ایک پنجہ مجھ پہ بھی پڑا۔ میں خونم خون ہو گئی۔ ہم نے بھاگ کر جان بچائی۔ جیسے تیسے اپنے بلوں میں پہنچے۔ مگر رستے میں ہمارے خون کے قطرے ٹپکے تھے۔ سنیاسی خون کی بوندوں کو دیکھتا ہوا چلا اور کمبخت میرے بل پہ آن دھمکا۔ اسے ڈھائی گھڑی کی موت آئے' بس فوراً ہی پھاوڑا لے کر میرا بل کھود ڈالا اور میری ساری جمع جتھا لے کر یہ جا وہ جا۔ گھر کی بربادی پہ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ مگر میں غریب چوہیا کیا کرتی۔ کس کے سامنے جا کے دہائی دیتی۔ غریبوں کمزوروں کی کون سنتا ہے۔

ویسے ستیاناسی سنیاسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگلی رات جب ہم مندروں میں گئے تو میں لاکھ اچھلی مگر چھینکے تک نہ پہنچ سکی۔ جب بھی چھلانگ لگائی دھپ سے نیچے گر پڑی۔ مورکھ سنیاسی جاگ رہا تھا۔ ادھر اپنی ناطاقتی پہ میرا دل رو رہا تھا اور اُدھر وہ ٹھٹھے لگا رہا تھا۔ پجاری سے کہنے لگا "پجاری جی' اب چنتا مت کرو۔ اس نے جو دھن جمع کیا تھا اس کے بل پہ اچھلتی تھی۔ اب یہ نردھنی چوہیا اس جوگی نہیں رہی کہ تمہارے چھینکے تک پہنچ سکے۔"

ادھر چوہیوں نے دیکھا کہ جس چوہیا کے بل پر وہ اچھلتی کودتی تھیں اس کے تو سارے کس بل نکل گئے تو پھر انہوں نے بھی طوطے کی سمان آنکھیں بدل لیں۔ ایک ایک کر کے سب سٹک گئیں۔ میں اکیلی رہ گئی۔

یہ قصہ سنا کر ہیرانگی چپ ہوئی۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولی "اے لگھوپٹنک کاگا' یہ ہے میری بپتا۔ آدمیوں اور چوہیوں دونوں کو میں نے بھر پایا۔ دونوں کا ایک ہی حال ہے۔ بال برابر کا بھی جو فرق ہو۔ دنیا کا یہ رنگ دیکھ کر دنیا سے میرا جی کھٹا ہو گیا۔ اور میں گوشہ نشین ہو گئی۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ صوفی بن جاؤں اور لمبے مراقبہ میں چلی جاؤں۔"

صوفی اور مراقبہ کے لفظوں پر لگھوپٹنک کے کان کھڑے ہوئے۔ بولا "اے ہیرانگی' یہ صوفی کس جناور کا نام ہے اور مراقبہ کس چڑیا کو کہتے ہیں۔ مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے۔ یہ نام میں نے پہلی مرتبہ سنے ہیں۔"

ہیرانگی نے ٹالتے ہوئے کہا "یہ اور طرح کا جوگ ہے۔ اس وقت تو میں بہت دکھی ہوں۔ میرے زخم پھر سے ہرے ہوگئے ہیں۔ طبیعت سنبھل جائے پھر بتاؤں گی کہ یہ کونسی بدیا ہے۔"

لگھوپٹنک نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ یہ قصہ سن کر خود بھی اداس ہو گیا تھا۔ "اچھا پھر ملیں گے۔" یہ کہہ کر جلدی ہی رخصت ہو گیا۔

ہیرانگی تو قنوطیت پسند تھی ہی۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر اور اس کی باتیں سن سن کر لگھوپٹنک بھی اپنے گرد و پیش سے بیزار رہنے لگا۔ ایک روز اس نے ہیرانگی کے سامنے ایک تجویز پیش کی "اے ہیرانگی' تو نے اس جنگل کے جانوروں کو صحیح پہچانا۔ یہ سب مورکھ ہیں۔ مندر میں جو پنڈت پجاری سنیاسی براجمان ہیں وہ بھی مجھے تو ادھرمی ہی دکھائی پڑتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم یہاں سے ہجرت کر جائیں۔"

ہیرانکی بولی ''ہجرت کر کے ہم کہاں جائیں گے۔ جہاں جائیں گے ایسے ہی لوگ ملیں گے۔ جس قماش کے کوے اور چوہیاں یہاں ہیں اسی قماش کے کووں اور چوہیوں سے ہمیں جہاں بھی جائیں گے پالا پڑے گا۔ اچھے کوے اور بھلی چوہیاں اب دنیا میں کہاں رہ گئی ہیں۔ اپنی دھرتی چھوڑ کر شرنارتھی بن کر بسر کرنے میں کونسی عقلمندی ہے۔''

لگھوپتنک بولا ''اپنے ہم جنسوں سے تو مجھے کوئی خیر کی توقع نہیں۔ مگر یہاں سے پورب کی اور ایک گھنی بنی ہے۔ اس بنی میں ایک جھیل ہے جہاں میرا یار من تھرک کچھوا رہتا ہے۔ وہاں کی زمین سونا اگلتی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی وہاں بہتات ہے۔ پھر منتھرک کا وہاں بہت اثر ورسوخ ہے۔ ہمیں وہاں کسی قسم کی دقت نہیں ہوگی۔ رہ گیا شرنارتھی بننا وہ تو اب ہمارا مقدر ہے۔''

ہیرانکی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر سوچ کر بولی ''میں تو اس جنگل میں اب خانہ برباد کی حیثیت سے بسر کر رہی ہوں۔ سنیاسی کے ہاتھوں میں لٹ چکی ہوں۔ گھر کہاں خاک بسر ہوں۔ اس جنگل کے باسیوں سے پہلے ہی ناتا توڑ چکی ہوں۔ اب کوئی بھی جگہ ہو مجھے تو سر چھپانے کے لیے ایک بل چاہیے۔ سو اگر تیری مرضی یہی ہے کہ یہاں سے ڈیرا اٹھا لیں تو مجھے منظور ہے۔ مگر تو تو اڑ کر جلدی ہی وہاں پہنچ جائے گا۔ میں اپنی چال سے چلوں گی۔ اتا پتا بتادے میں مر گر کر وہاں پہنچ ہی جاؤں گی۔''

''نہیں 'یوں نہیں'' لگھوپتنک بولا ''اکیلے سفر میں تو بہت جوکھوں ہے۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے کے چلوں گا۔ تو ننھی سی جان میری پیٹھ پہ بیٹھ جائیو۔ ویسے بھی سفر میں ایک سے دو اچھے ہوتے ہیں۔ باتوں باتوں میں سارا سفر کٹ جائے گا۔''

اس طرح سفر کا پروگرام طے ہوا۔ اگلے دن صبح ہی صبح ہیرانکی کے بل پر لگھوپتنک آن موجود ہوا۔ ہیرانکی کو اپنی پیٹھ پہ بٹھایا اور پورب کی اور اڑنے لگا۔

ادھر کی سنو۔ منتھرک جھیل کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ کوے کی آواز اچانک کان میں پڑی تو نظر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کوا جس کی پیٹھ پہ ایک چوہیا بیٹھی ہے اڑا چلا آ رہا ہے۔ یہ انہونی دیکھ کے وہ تو دنگ رہ گیا۔ حیرت کے دریا میں غوطہ لگایا۔ اس کے ساتھ ہی غڑاپ سے جھیل میں ڈبکی لگائی۔

لگھوپتنک نے ہیرانگی کو جھیل کنارے اتارا اور خود پاس ہی کھڑے درخت کی پھننگ پہ بیٹھ کے کائیں کائیں کرنے لگا۔ ادھر ہیرانگی بل کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ سوچ رہی تھی کہ کوئی بل نظر آئے تو اس میں گھس کے ستالوں اور سفر کی تھکان اتاروں۔

لگھوپتنک نے دیکھا کہ منتھرک تو اس کی طرف توجہ ہی نہیں کر رہا۔ اس نے شکایت کے لہجہ میں کہا کہ اے یارِ عزیز، میں اتنی دور سے چل کر تجھ سے ملنے آیا ہوں۔ میں تیرا یار لگھوپتنک۔ اور تو مجھے پہچاننے سے انکاری ہے۔"

اب منتھرک چونکا۔ تیزی سے جھیل سے باہر آیا۔ شاخ سے اتر کر لگھوپتنک نیچے آیا۔ دونوں گرمجوشی سے گلے ملے۔ پہلے خوب گلے شکوے ہوئے۔ پھر لگھوپتنک نے بتایا کہ "اے میرے یار، میں تو اب ہجرت کر کے تیرے دیس میں آگیا ہوں۔ بس سمجھ لے کہ میں نے اپنے وطن کو سلام کر لیا۔ اب میں شرنارتھی ہوں۔"

منتھرک نے اس پر اسے بہت دلاسا دیا۔ کہا کہ "بھول جا کہ تو شرنارتھی ہے۔ اب اس بن کو اپنا دیس جان۔ یہاں بھی سب اپنے ہی ہیں۔ اور میں تیرا پرانا یار

ع

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

لگھوپتنک نے ہنس کر کہا کہ "نہیں، ایک تیسری دیوانی بھی ہے۔" اور ہیرانگی کی طرف اشارہ کیا جو چپکے سے لگھوپتنک کے برابر آن بیٹھی تھی۔

منتھرک نے اسے تعجب سے دیکھا۔ کہا کہ "یہ آگ اور پانی کا میل کیسا۔ ذرا اس بی بی سے پرے ہو جائے۔"

"اے منتھرک یہ ہیرانکی راجکماری ہے۔ غریب دکھیاری ہے۔ اجڑ کر یہاں آئی ہے۔ کہنے کو چوہیا مگر علم کا سمندر ہے۔ ویدوں شاستروں میں پیری ہوئی۔ مگر ایسی بپتا پڑی ہے کہ کسی اور ہی طرف چل پڑی ہے۔ ایسے علم کا ذکر کرتی ہے جس کا میں نے کبھی نام ہی نہیں سنا۔ کہتی ہے میں صوفی ہو گئی ہوں۔"

منتھرک نے ہیرانکی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور پوچھا "اے راجکماری' کہیں تو نے تصوف کی پستکیں تو نہیں پڑھ لی ہیں۔"

"ہاں کچھ صوفیا کے ملفوظات میری نظر سے گذرے ہیں۔"

منتھرک نے سر پیٹ لیا اور کہا کہ "یہ تو ملیچھوں کی بدیا ہے۔ تو ویدوں شاستروں کو چھوڑ کر ادھر کیسے نکل گئی۔"

بولی "ویدوں شاستروں کو میں نے بہت پڑھا۔ مگر پنڈتوں سنیاسیوں پجاریوں کے لچھن دیکھ کر میرا دل اس ودیا سے کھٹا ہو گیا اور تصوف ملیچھوں کی بدیا تو ہے۔ مگر میں علمی معاملات میں تعصب نہیں برتتی۔ روشنی جہاں سے بھی ملے لے لینی چاہیے۔"

"خیر اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔" منتھرک بولا "پہلے اپنی بپتا سنا۔ کچھ پتہ تو چلے کہ تیرے دماغ میں یہ فتور کیسے پیدا ہوا۔"

ہیرانکی نے یہ سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور یہ شعر پڑھا ؎

کیا حال اپنا پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

پھر اپنی بپتا سنائی کہ سنیاسی اور پجاری نے اس کے خلاف کیسی سازش کی اور

پھر چوہیوں نے جن پر اسے اتنا مان تھا اس سے کس طرح آنکھیں پھیریں۔

منتھرک نے یہ بپتا سن کر ہیرانگی سے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا "اے ہیرانگی تیری بپتا سچ مچ بہت دکھ بھری ہے۔ مجھے سن کر افسوس ہوا۔"

ہیرانگی نے کہا "اے منتھرک، میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ میری قسمت میں یہی کچھ لکھا تھا۔"

اس پر منتھرک بولا "اے ہیرانگی تو نے قسمت کی بات کی تو سن کہ میں اس وقت سو کے پیٹے میں ہوں۔ ان سو برسوں میں میں نے قسمتوں کے بننے بگڑنے اور بگڑ کر پھر بننے کا تماشہ بہت دیکھا ہے۔ یہ جیون کا کھیل عجب ہے۔ کیسا کیسا دھنی لکھ پتی دم کے دم میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بھی دیکھا ہے کہ جو کوڑی کوڑی کو محتاج پھرتے ہیں دم کے دم میں ان کے دن پھرتے ہیں اور وہ دولت میں کھیلنے لگتے ہیں۔ بس جیسے بھائی سادھو ہونی کے ساتھ ہوا۔"

ہیرانگی نے پوچھا "یہ بھائی سادھو ہونی کون تھا اور اس کے دن کیسے پھرے۔"

اس پر منتھرک نے بھائی سادھو ہونی کے ساتھ جو ہوئی وہ اس طرح سنائی۔

بھائی سادھو ہونی کی کہانی

دور کی ایک بستی میں ایک بیوپاری رہتا تھا۔ اس کا ایک کھلنڈرا بیٹا تھا۔ ایک دن وہ ایک پستک خرید کر لایا اور بڑے شوق سے اس نے یہ پستک باپ کو دکھائی کہ "پتا جی، آج میں نے یہ پستک خریدی ہے۔ دیکھو کیا کمال کی چیز ہے۔"

بیوپاری نے پستک لے کر اس کے ورق الٹے پلٹے۔ وہاں بس ایک ہی بول لکھا ہوا تھا ع

کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہونی ہو کے رہی

بیوپاری نے یہ دیکھ بیٹے سے پوچھا "یہ پستک تو نے کتنے میں خریدی۔"

بیٹا بولا "بہت سستی۔ بس سو روپے میں مل گئی۔"

بیوپاری غصے سے بولا "ایک بول والی پستک اور سو روپے میں۔ اگر تو نے اس رنگ سے بیوپار کیا تو میرے بیوپار کا توپڑا ہو جائے گا۔ نکل جا میرے گھر سے۔"

بیٹا گھر سے نکل گیا۔ بستی بستی مارا پھرنے لگا۔ جو کوئی پوچھتا کہ "لالہ' تیرا نام کیا ہے۔ کس بستی سے آیا ہے۔ نگھرا کیوں پھر رہا ہے۔"

وہ سارے سوالوں کا ایک ہی جواب دیتا کہ ع

کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہونی ہو کے رہیؔ

لوگوں نے اسے بھائی سادھو ہونی کہنا شروع کر دیا۔ بس پھر یہ نام اس کے ساتھ چپک گیا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک راجکماری جس کا نام چندروتی تھا میلہ دیکھنے گئی۔ وہاں اس نے ایک راجکمار کو دیکھا۔ اس کے رنگ روپ' اس کی آن بان نے اس کا دل موہ لیا۔ اس نے اپنی باندی سے کہا کہ اے باندی' کوئی ایسی ترکیب کر کہ اس راجکمار سے میری ملاقات ہو جائے۔

باندی یہ اشارہ لے کر اس راجکمار کے پاس پہنچی۔ کھٹی میٹھی باتیں کر کے اسے شیشے میں اتارا اور راجکماری سے ملاقات پہ آمادہ کر لیا۔

"مگر ملاقات کیسے ہو۔" راجکمار نے پوچھا۔

باندی بولی "رات گئے' محل کی پچھلی والی دیوار کی طرف آجائیو۔ وہاں تمہیں ایک رسی لٹکی نظر آئے گی۔ اس کے سہارے اوپر آجانا۔ بس سامنے ہی راجکماری کی اٹریا ہے۔ وہاں وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہو گی۔"

راجکمار نے اس وقت تو ہامی بھر لی۔ مگر بعد میں وہ دبدا میں پڑ گیا۔ پھر وہ ادھر گیا ہی نہیں۔ مگر ایسا ہوا کہ بھائی سادھو ہونی رات گئے اس طرف سے گزرا تو اس نے دیکھا

بیٹا بولا "بہت سستی۔ بس سو روپے میں مل گئی۔"

بیوپاری غصے سے بولا "ایک بول والی پستک اور سو روپے میں۔ اگر تو نے اس رنگ سے بیوپار کیا تو میرے بیوپار کا توپڑا ہو جائے گا۔ نکل جا میرے گھر سے۔"

بیٹا گھر سے نکل گیا۔ بستی بستی مارا پھرنے لگا۔ جو کوئی پوچھتا کہ "لالہ' تیرا نام کیا ہے۔ کس بستی سے آیا ہے۔ نگھرا کیوں پھر رہا ہے۔"

وہ سارے سوالوں کا ایک ہی جواب دیتا کہ ع

کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہونی ہو کے رہی

لوگوں نے اسے بھائی سادھو ہونی کہنا شروع کر دیا۔ بس پھر یہ نام اس کے ساتھ چپک گیا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک راجکماری جس کا نام چندروتی تھا میلہ دیکھنے گئی۔ وہاں اس نے ایک راجکمار کو دیکھا۔ اس کے رنگ روپ' اس کی آن بان نے اس کا دل موہ لیا۔ اس نے اپنی باندی سے کہا کہ اے باندی' کوئی ایسی ترکیب کر کہ اس راجکمار سے میری ملاقات ہو جائے۔

باندی یہ اشارہ لے کر اس راجکمار کے پاس پہنچی۔ کھٹی میٹھی باتیں کر کے اسے شیشے میں اتارا اور راجکماری سے ملاقات پہ آمادہ کر لیا۔

"مگر ملاقات کیسے ہو۔" راجکمار نے پوچھا۔

باندی بولی "رات گئے' محل کی پچھلی والی دیوار کی طرف آ جائیو۔ وہاں تمہیں ایک رسی لٹکی نظر آئے گی۔ اس کے سہارے اوپر آ جانا۔ بس سامنے ہی راجکماری کی اٹریا ہے۔ وہاں وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہو گی۔"

راجکمار نے اس وقت تو ہامی بھر لی۔ مگر بعد میں وہ دبدا میں پڑ گیا۔ پھر وہ ادھر گیا ہی نہیں۔ مگر ایسا ہوا کہ بھائی سادھو ہونی رات گئے اس طرف سے گذرا تو اس نے دیکھا

کہ محل کی دیوار پہ ایک رسی لٹکی ہوئی ہے۔ سوچنے لگا کہ یہ رسی کیوں لٹکی ہوئی ہے۔ آوارہ تو پھر ہی رہا تھا۔ سوچا کہ چلو چڑھ کر دیکھتے ہیں۔ جو ہونی ہے وہ تو ہو کے رہے گی ہی۔ سو وہ رسی کے سہارے محل کی چھت پہ چڑھ گیا اور راجکماری کی اٹریا میں پہنچ گیا۔ راجکماری سمجھی کہ راجکمار آ گیا۔ بہت خوش ہوئی۔ بہت اس کی آؤ بھگت کی۔ پھر کہنے لگی "اے راجکمار میں تو تجھے دیکھتے ہی دل دے بیٹھی۔ اب میں بواہ کروں گی تو تجھ سے کروں گی۔ نہیں تو ندی میں کود کے جان دیدوں گی۔"

بھائی سادھو ہونی نے محبت کے سارے بولوں کا ایک ہی جواب دیا ع

کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہونی ہو کے رہی

چندراوتی یہ جواب سن کر چکرائی۔ پھر اسے شک ہوا۔ اس نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ اب اسے پتہ چلا کہ یہ تو وہ راجکمار نہیں ہے۔ کوئی اور ہی جناور ہے۔ اس نے غصے سے آ کر اسے دھتکارا "نکل جا موئے یاں سے۔ ورنہ ابھی تجھے پکڑواتی ہوں۔"

بھائی سادھو ہونی نے پھر وہی کبیر کا بول دہرایا اور جیسے آیا تھا ویسے ہی وہاں سے نکل گیا۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک ویران مندر میں جا سویا۔

اس ویران شکستہ حال مندر میں نہ کوئی پجاری نہ پنڈت۔ ہاں رات کو چوکی پہرہ دینے والے نے کسی عورت سے یہاں ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ یہاں پہنچا اور ایک نوجوان کو سوتے دیکھا تو بہت جز بز ہوا۔ اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور پوچھا "تو کون ہے رے۔"

اس نے جواب میں وہی اپنا محبوب بول دہرایا۔

پہریدار کچھ نہ سمجھا۔ بہر حال وہ اسے یہاں سے ٹرخانا چاہتا تھا۔ فوراً ایک ترکیب سوچی اور کہا "یہ کوئی سونے کی جگہ ہے۔ برابر کی گلی میں میرا گھر ہے۔ اس کی

ڈیوڑھی میں بہت جگہ ہے۔ وہاں جاسو۔"

بھائی سادھو ہونی بتائے ہوئے پتہ پر اس کے گھر پہنچا اور بجائے ڈیوڑھی میں سونے کے ایک کوٹھڑی میں جس کا پٹ کھلا تھا گھس گیا۔ اصل میں وہاں پہریدار کی بیٹی ونایاوتی اپنے عاشق کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اندھیرے میں صورت تو نظر نہ آئی۔ بھائی سادھو ہونی کو اپنا عاشق جان کر لپٹ گئی۔ اور لگا بوس و کنار ہونے۔ دیر بعد ونایاوتی بولی کہ "ارے آج تو بولتا نہیں۔ کیا گونگے کا گڑ کھا کے آیا ہے۔"

بھائی سادھو ہونی چہک کر بولا ع

کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہونی ہو کے رہی

اب ونایاوتی کو ہوش آیا کہ یہ کمبخت مردوا تو کوئی اور ہے۔ اس نے دو ہتڑ مار کے اسے باہر نکال دیا۔

بھائی سادھو ہونی چلا جارہا تھا کہ رستے میں ایک بارات باجے گاجے کے ساتھ جاتی نظر آئی۔ یہ آگے بڑھ کر براتیوں میں شامل ہو گیا۔ لیکن ابھی بارات چار قدم آگے بڑھی تھی کہ کہیں سے ایک مست ہاتھی وہاں آنکلا۔ اس نے وہ آفت مچائی کہ سارے براتی بھاگ اٹھے۔ براتی ہی نہیں دولہا نے بھی بھاگ کر جان بچائی۔ دلھن کا ڈولا وہیں چھوڑ کر کہار بھی نو دو گیارہ ہوگئے۔ دلہن پریشان کہ کیا کرے۔ بھائی سادھو ہونی لپک کر اس کے پاس پہنچا اور کہا کہ فکر مت کر میں جو ہوں۔ اور جب ہاتھی نے اس طرف کا رخ کیا تو قریب ہی پڑا ایک ڈنڈا دیکھ کر اس نے اٹھایا اور ہاتھی پر پل پڑا۔ اور عجب ہوا کہ ہاتھی ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ہاتھی کے چلے جانے کے بعد جب براتی واپس آئے اور دولہا پلٹا تو دیکھا کہ دلھن تو کسی اور کے پہلو میں کھڑی ہے۔ اس نے فوراً دلھن کے باپ سے فریاد کی۔ باپ نے آکر بیٹی سے باز پرس کی تو اس نے کہا کہ "بابا، دولھا تو مجھے ہاتھی کے سامنے

اکیلا چھوڑ کے چمپت ہو گیا تھا۔ اس جیالے نوجوان نے آکر میری جان بچائی۔ اب تو یہی میرا دولھا ہے۔"

اس پر اتنا شور پڑا کہ آس پاس کے سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ راجہ کو اس کی خبر ملی تو وہ بھی وہاں آگیا۔ اس کے سامنے یہ مقدمہ پیش تھا کہ چندراوتی بھی وہاں آن پہنچی۔ راجہ نے اس نوجوان سے پوچھا تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اس نے وہی بنا بنایا جواب دیا ع

کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہونی ہو کے رہی

چندراوتی کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے چلّا کے کہا کہ "ارے یہ تو وہی ہے۔"

راجہ نے تعجب سے پوچھا "اے بیٹی، تم اسے کیسے جانتی ہو۔"

چندراوتی نے اپنا پورا واقعہ اسے سنا دیا۔ ادھر ونایاوتی بھی آن پہنچی تھی۔ اس نے بھی اسے پہچانا اور اپنا قصہ سناڈالا۔

راجہ نے سوچا کہ یہ تو کوئی نرالا ہی نوجوان ہے۔ اس نے فوراً ہی چندراوتی کی اس سے شادی کی بات پکی کر دی۔ ونایاوتی بھی اب اس پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ کہنے لگی کہ میں تو اب اسی سے بواہ کروں گی۔

اس طرح بھائی سادھو ہونی کو آن کی آن میں تین دلھنیں مل گئیں اور بہت سا جہیز۔ پھر راجہ نے اپنے راج پاٹ کا وارث بھی اسے ہی بنا دیا۔

یہ کہانی سنا کر منتھرک نے کہا کہ "اے ہیرانگی۔ قسمت بگڑ کر اس طرح بھی سنورتی ہے۔ سو کسی کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ سو صبر کر اور دیکھ کہ قسمت آگے چل کر کیا رنگ بدلتی ہے۔"

ہیرانگی یہ سن کر ادب سے بولی "اے مہان آتما انتھرک، میں تمہارا بہت آدر

کرتی ہوں۔ تم نے عمر کے سو برس دیکھے اور ودیا کا تم ساگر ہو اور تم تو اس جاتی سے ہو جس کی پیٹھ پہ یہ دھرتی ٹکی ہوئی ہے۔ تم نے بھائی سادھو ہونی کی کتھا خوب سنائی مگر سوم لک کے ساتھ جو قسمت نے کھیل کھیلا وہ قصہ شاید تم نے نہیں سنا۔

منتھرک نے تعجب سے پوچھا کہ ''سوم لک کون تھا۔ اور اس کے ساتھ قسمت نے کیا کھیل کھیلا۔''

لگھوپٹنک کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ بولا ''میرے لیے بھی یہ نیا نام ہے۔ سوم لک کون پرش تھا۔ اس کے بھاگ میں کیا لکھا تھا۔''

اور ہیرانگی نے سوم لک کی کہانی اس طرح سنائی:

جولاہے کی قسمت

کسی بستی میں سوم لک نام کا ایک جولاہا رہتا تھا۔ کپڑا ایسا نفیس بنتا تھا کہ راجہ مہاراجہ اسے پہنتے اوڑھتے تھے۔ لیکن اس کے بھاگ کھوٹے تھے۔ کمائی بس اتنی ہوتی تھی کہ گھر کا خرچ مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ اور گھر میں تھا ہی کون۔ ایک وہ اور دوسرا دم جولاہی اس کی پتنی۔ اس کے مقابلہ میں جو اناگھڑ جولاہے تھے وہ خوب کماتے تھے۔

ایک دن اس نے اپنی پتنی سے کہا کہ ''یہاں تو میرا کام چلتا نہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ کہیں پردیس میں جا کر اپنا ہنر دکھاؤں اور قسمت آزماؤں۔''

پتنی بولی ''اے میرے بھولے پتی۔ پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے۔ جب تو اپنے ٹھیئے پہ بیٹھ کے نہ کما سکا تو دوسرے دیس جا کے کیا کمائے گا۔ یہ نہ ہو کہ تو گھر سے بے گھر بھی ہو اور جو تن چھپانے اور پیٹ بھرنے کے لیے ہمیں مل جاتا ہے اس سے بھی ہم جائیں۔ میری مان اور اپنے ٹھیئے پہ بیٹھا رہ۔''

مگر سوم لک نہ مانا۔ اس پہ تو سفر کی سنک سوار ہو گئی تھی۔ بستر بوریا باندھا اور چل کھڑا ہوا۔

Scanned by CamScanner

سوم لک نے پردیس جاکر وردھناپور نامی بستی میں جاکر ڈیرا ڈالا۔ وہاں اس کا کاروبار خوب چمکا۔ برس بھر میں اس نے اتنا کمایا کہ تین سو اشرفیاں جمع کر لیں۔ اتنا کما کر اس نے گھر واپس جانے کی ٹھانی۔

چلتے چلتے راستے میں جنگل ایسے وقت میں آیا جب رات اتر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ رات کو جنگل میں سفر کرنے میں جوکھوں ہے جبکہ تین سو اشرفیاں بھی گرہ میں ہیں۔ بس وہ وہیں جنگل کنارے ایک درخت کے نیچے پڑ رہا۔ سوتے میں اس نے عجب خواب دیکھا۔ جیسے دو بندے ہیں ڈراونی شکل والے۔

ایک بولا "اے کرما' تجھے کیا پتہ نہیں تھا کہ سوم لک کی قسمت میں بس اتنا لکھا ہے جس سے اس کے گھر کا بس خرچ پورا ہو جائے۔ پھر تو نے اسے اتنی بہت سی اشرفیاں کیوں دلوادیں۔"

کرما بولا "اے بھاگ دیوتا' میں کیا کرتا۔ اس نے اتنی محنت کی۔ محنت کا پھل میں اس سے کیسے چھین لیتا۔ آگے تو جان۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنی گانٹھ کو کھول کر دیکھا۔ اشرفیاں غائب تھیں۔ وہ بہت دکھی ہوا۔ سال بھر کی ساری محنت پہ پانی پھر گیا۔ مگر وہ خالی ہاتھ تو گھر نہیں جاسکتا تھا۔ پھر واپس وردھناپور جاکر اپنے کام سے لگ گیا۔ اب کے اس نے پہلے سے بھی زیادہ محنت کی۔ سو اب کے زیادہ کمائی ہوئی۔ اب کے وہ پانچ سو اشرفیاں گرہ میں باندھ کر نکلا۔ مگر اب کے بھی وہی کچھ ہوا جو پہلے ہوا تھا۔ جنگل کنارے پہنچ کر اس نے رات ایک درخت تلے بسر کی۔ جب سویا تو پھر وہی خواب دکھائی دیا۔

"اے کرما' تو نے پھر سوم لک کو نہال کر دیا۔ تجھے خوب پتہ تھا کہ اس کے بھاگ میں بس اتنا لکھا ہے کہ تن کو کپڑا اور پیٹ کو روٹی میسر آجائے۔ مگر تو نے تو اسے پانچ سو اشرفیاں دلوا کر دھنی بنادیا۔"

"اے بھاگ دیوتا۔ میرا اس میں کیا قصور ہے۔ پانچ سو اشرفیاں اس کی محنت کی کمائی ہیں۔ محنت کا پھل میں اس سے کیسے چھینتا۔ باقی تو جان کہ اس کے بھاگ میں کیا لکھا ہے۔"

سوم لک ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنی گرہ کو ٹٹولا۔ اشرفیاں گرہ سے غائب تھیں۔ اس کا دل ٹوٹ گیا اور ہمت بھی۔ دل میں کہا کہ میرے بھاگ میں جتنا لکھا ہے اتنا ہی ملے گا۔ میں نے خواہ مخواہ اتنا کشٹ اٹھایا اور گھر سے بے گھر ہوا۔ اس کے بعد اس نے زیادہ کمانے کی ہوس کو دل سے دفع کیا اور اپنے نگر واپس جا کر اپنے ٹھیئے پر بیٹھ گیا۔

یہ کہانی سنا کر ہیرانگی نے کہا کہ "اے انترک، سوم لک کی مثال سے میں نے عبرت حاصل کی اور دولت کمانے اور مال واسباب اکٹھا کرنے کی ہوس کو دل سے نکال دیا۔ اب مجھے اپنے بھاگ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ جس حال میں بھی ہوں خوش ہوں۔ اے انترک سن کہ ہیرانگی سگ دنیا نباشد۔ اس نے اپنے نفس پر قابو پالیا اور دنیا سے کنارہ کر لیا۔"

انترک سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر لگھوپتنک سے مخاطب ہوا "اے لگھوپتنک، اس تیری یار چوہیا نے صوفیوں کی زبان میں کلام کرنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے اس کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔" پھر ہیرانگی سے مخاطب ہوا "اے راجکماری، تو نے ساری ودیائیں گھول کے پی لیں۔ پر نیتی شاستر بھی پڑھ لیے ہوتے تو تجھے اس دنیا میں زندگی گذارنے کے گر آجاتے۔ اب بھی وقت ہے۔ تصوف وصوف کو چھوڑ اور 'پنچ تنتر' پڑھ جس میں نیتی شاستروں کا نچوڑ ہے۔ پھر تجھے پتہ چلے گا کہ دنیا کیا ہے 'لوگ کیا ہیں۔ ان کے بیچ جینے کے لیے عقل کی کتنی ضرورت ہے۔"

ہیرانگی یہ کلام سن کر مسکرائی۔ پھر بولی "اے انترک، چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس ہیچ پوچ چوہیا کی زبان کیوں کھلواتا ہے۔ 'پنچ تنتر' سر آنکھوں پر۔ مگر کلیلہ دمنہ کی

کہانی کیا کہتی ہے۔ کلیلہ تو صوفی نہیں تھا۔ وہ کیوں دنیا سے منہ موڑ کر اپنے بھٹ میں بیٹھ گیا۔ دمنہ نے شیر کے دربار میں مرتبہ حاصل کیا مگر کیسے۔ اور اس چند روزہ عروج سے اس نے کیا پایا۔"

انتھرک تو ہکابکا رہ گیا۔ کتنی دیر تک ہیرانگی کا منہ تکتا رہا۔ پھر بولا "اے چوہیا' تو جیتی میں ہارا۔" پھر لکھوٹینک کی طرف دیکھا جو ہیرانگی کی باتیں سن کر تصویر حیرت بن گیا تھا۔ بولا "اے کوے' تو بھی بہت ودھوان بنتا ہے۔ مگر ایک بات اس بوڑھے کچھوے کی سن لے۔ جب چوہیا کتابیں پڑھ پڑھ کے علامہ بن جائے تو بڑے بڑے عالم فاضل اس کے سامنے چوہے بن جاتے ہیں۔" رکا۔ پھر بڑبڑایا "مگر جو کچھوا پیدا ہوا ہے وہ چوہا کیسے بن جائے۔" اور یہ کہتے کہتے غڑاپ سے جھیل میں اتر گیا۔

کہانی کیا کہتی ہے۔ کلیلہ تو صوفی نہیں تھا۔ وہ کیوں دنیا سے منہ موڑ کر اپنے بھٹ میں بیٹھ گیا۔ دمنہ نے شیر کے دربار میں مرتبہ حاصل کیا مگر کیسے۔ اور اس چندروزہ عروج سے اس نے کیا پایا۔"

انتھرک تو ہکا بکارہ گیا۔ کتنی دیر تک ہیرانگی کا منہ تکتا رہا۔ پھر بولا "اے چوہیا' تو جیتی میں ہارا۔" پھر لکھوٹینک کی طرف دیکھا جو ہیرانگی کی باتیں سن کر تصویر حیرت بن گیا تھا۔ بولا "اے کوے' تو بھی بہت ودھوان بنتا ہے۔ مگر ایک بات اس بوڑھے کچھوے کی سن لے۔ جب چوہیا کتابیں پڑھ پڑھ کے علامہ بن جائے تو بڑے بڑے عالم فاضل اس کے سامنے چوہے بن جاتے ہیں۔" رکا۔ پھر بڑبڑایا "مگر جو کچھوا پیدا ہوا ہے وہ چوہا کیسے بن جائے۔" اور یہ کہتے کہتے غڑاپ سے جھیل میں اتر گیا۔

مہابن کے بندروں کا قصہ

یہ مہابن کے بندروں کی عبرت بھری داستان ہے جن کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ جہاں وہ رہا کرتے تھے وہاں آج آدمیوں کا ایک شہر آباد ہے جہاں اونچے درختوں کی جگہ فلک بوس عمارتیں کھڑی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں گھنی بنی تھی۔ درخت درخت بندر تھے جن کا کوئی گنتی شمار نہ تھا۔ ان بندروں کے دانت تیز' پنجے سخت اور جسم توانا تھے۔ قریب و دور کے باغات پر دھاوے بولنا' ہرے بھرے درختوں پر زقندیں لگانا' کچے پکے پھل توڑ کر کھانا' یہ ان کی زندگی تھی۔ ان کے دل بڑے اور حوصلے بلند تھے۔ کالے کوسوں سفر کرتے' آسمان سے باتیں کرتے ہوئے درختوں پر جھولتے اور لمبی سے لمبی چھلانگ لگاتے۔

باغوں اور کھیتوں کے رکھوالی ان بندروں کے ہاتھوں بہت خراب تھے۔ یہ بندر ایسے خونخوار تھے کہ باغوں اور کھیتوں کے رکھوالیوں میں ان سے مقابلہ کی تاب نہیں تھی۔ ایک بار ایک دانا دہقان نے خوب ترکیب سوچی۔ وہ ایک روز بہت سے چنے گڑ کی ایک بھیلی اور چند ڈنڈے لے کر مہابن کے ایک پیڑ کے نیچے رکھ آیا۔ واپس آکر اس نے کھیتوں اور باغوں والوں سے کہا کہ اب تمہاری فصلیں محفوظ ہیں اور مسافروں

کاسفر پرامن ہو گا کہ میں بندروں کا انتظام کر آیا ہوں۔

چنوں اور گڑ کی بھیلی کو دیکھ کر سارے بندر پیڑوں سے نیچے اتر آئے۔ اور چنوں پر ٹوٹ پڑے۔ چنے تو خیر وہ مل جل کر کھا رہے تھے مگر ایک ندیدے بندر نے یہ کیا کہ گڑ کی بھیلی لے کر الگ جا بیٹھا۔ ایک توانا بندر نے یہ دیکھا تو چھلانگ لگا کر اس کے پاس جا پہنچا اور بھیلی اس سے اچک کر الگ لے بیٹھا۔ ایک پھرتیلے بندر نے داؤں پا کر بھیلی اٹھائی اور ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔ بھیلی کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر سب بندر اسی پر ٹوٹ پڑے۔ پھر تو بھیلی تھالی کا بینگن بن گئی۔ کبھی اس ہاتھ میں کبھی اس ہاتھ میں۔ اس ہنگامے میں ایک بندر کو عجب سوجھی۔ اس نے ایک ڈنڈا اٹھایا اور بھیلی والے بندر کے سر پر دے مارا۔ اس بندر کا سر کھل گیا اور بھیلی ہاتھ سے گر پڑی۔ ڈنڈے والے بندر نے فوراً بھیلی کو ہتھیا لیا۔ دوسرے بندر پہلے تو یہ منظر دیکھ کر سہم گئے مگر پھر انہوں نے دیکھا کہ ڈنڈے ابھی اور بھی پڑے ہیں۔ توانا بندروں نے جھپٹ کر ایک ایک ڈنڈا اٹھا لیا۔ بس پھر نہ پوچھو کہ پھر بندروں میں کیسی لڑائی ہوئی۔ کسی کا سر پھٹ گیا۔ کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کسی کا منہ لہولہان ہو گیا۔

بندر جب لڑتے لڑتے تھک گئے تو دم لینے کے لیے وہ الگ الگ جا بیٹھے۔ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ ان کا بزرگ بندر پیپل کی اونچی گدے پر آنکھیں بند کیے سر نیوڑھائے بیٹھا ہے۔ اصل میں وہ بزرگ بندر بندروں کی دنیا کا دانشمند تھا۔ سب بندر اس کا بہت ادب کرتے تھے۔ اسے یوں آنکھیں بند کیے سر نیوڑھائے بیٹھا دیکھ کر سب اس کی خدمت بابرکت میں پہنچے اور خاموشی کا سبب پوچھا۔ تب اس نے سر اٹھا کر سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں دیکھا اور تاسف بھرے لہجے میں کہا کہ بندروں کا قومی اخلاق گر گیا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ آدمیت کے گڑھے میں گر گئے ہیں اور بندرانہ اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے۔"

دانش مند بندر کی اس بات نے بندروں پر بڑا اثر کیا۔ دوسرے دن وہ بالکل نہیں لڑے۔ ہوا یوں کہ جب دانا دہقان گڑ اور چنے پیڑ کے نیچے رکھ کر گیا تو جن بندروں کے ہاتھوں میں ڈنڈے آ گئے تھے۔ انہوں نے مال سنگھوالیا۔ پھر سب بندروں میں حصہ رسد تقسیم کر دیا۔ بندر بہت خوش ہوئے کہ آج سر بھی نہیں پھوٹا اور چنے بھی کھانے کو مل گئے۔

وہ دانا دہقان بھی خوب نکلا کہ روز بہت سے چنے اور گڑ رکھ جاتا۔ بندر اسے غنیمت جانتے کہ انہیں باغوں پر دھاوا بولے بغیر ہی کھاجا مل جاتا ہے مگر بندر بانٹ مشہور ہے۔ کبھی کبھی کوئی بندر زیادہ حصہ بٹا لیتا۔ کبھی کسی خوبصورت بندریا کو زیادہ حصہ مل جاتا۔ اس پر بندر شاخوں پر چڑھ کر خوب شور مچاتے۔ کوئی کوئی بندر کچکچا کو کسی بندر سے لپٹ جاتا۔ تھوڑی لڑائی ہوتی، مگر پھر آپ ہی آپ امن قائم ہو جاتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ چنے تھوڑے پڑ گئے۔ بندر ایک دوسرے پر خوب کچکچائے۔ کوئی چیختا چیختا درخت کی سب سے اونچی شاخ سے شور مچاتا ہوا نیچے اتر آیا اور اس کا منہ لال انگارہ ہو گیا۔ مگر تھک ہار کر سب چپ ہو گئے۔ دوسرے دن چنے کچھ اور کم ہو گئے اور ایسا ہوا کہ کچھ بندروں نے کلے بھر لیے اور کچھ کو دو چار دانوں سے زیادہ نصیب نہ ہوا۔ پھر تیسرے دن ایسا ہوا کہ گڑ اور چنے جب لا کر رکھے گئے تو اس کے تھوڑی دیر بعد چنے ہی چنے رہ گئے، گڑ غائب تھا۔ پتہ نہیں چلا کہ بھیلی کس بندر نے اٹھائی اور کہاں چھپائی۔ پھر یہ روزمرہ بن گیا کہ گڑ کی بھیلی تو بالا ہی بالا غائب ہو جاتی اور چنوں کا یہ ہوتا کہ کسی کو ملے ملے نہ ملے۔ بندر شروع میں تو بہت شور مچایا کرتے تھے مگر پھر ان کا غصہ ٹھنڈا پڑتا چلا گیا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ باغوں اور کھیتوں پر دھاوا بولنے کا طریقہ وہ بالکل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ان کی ساری توجہ ان چنوں اور گڑ پہ رہتی تھی جو پیڑ کے نیچے لا کر رکھا جاتا تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ چنوں کے نہ ملنے پر بندروں نے خوب شور مچایا۔ اس عالم میں ایک نوجوان بندر تنے کے سہارے کھڑا ہوا اور چنے کی بے ثباتی پر تقریر کرنے لگا۔ بندروں کے لیے یہ نرالی بات تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مقرر بندر کو دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بندر نے اپنی بندریا کے سر سے جوئیں بین بین کو ٹونگتی شروع کر دیں۔ ایک ننھی بندریا ایک شاخ پر چڑھی اور الٹی لٹک گئی۔ جب وہ بندر تقریر ختم کر چکا تو دانشمند بندر نے اسے غور سے دیکھا اور افسوس کے ساتھ اعلان کیا کہ ''یہ بندر آدمی بنا چاہتا ہے۔''

اس اعلان پر بندروں میں سنسنی پھیل گئی۔ سب نے مقرر بندر کو غور سے دیکھا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ آدمی کس طرف سے ہے۔ مقرر بندر نے غصے سے کہا کہ ''یہ مجھ پر اتہام ہے۔''

تب دانشمند بندر نے کہا کہ ''اے بندر لوگو بندر چنے کھایا کرتے ہیں۔ چنے پر تقریر نہیں کرتے۔ جب کوئی بندر تقریر کرنے لگے تو جاننا چاہیے کہ بندر قوم پر زوال آگیا۔ اس کا کوئی فرد قالب بدلا چاہتا ہے۔''

بندروں نے پوچھا: ''اے ہمارے بزرگ قالب بدلنے کا کیا مطلب ہے؟''

دانشمندر بندر نے کہا: ''اے بندر لوگو جب ایک بندر کسی غیر بندر قوم کے رنگ میں رنگ جائے اور چار دن کی زندگی کی خاطر اپنے جینے کا طور بدل لے تو اسے قالب بدلنا کہتے ہیں۔ کیا تم نے جان عالم بندر کا قصہ نہیں سنا؟''

بندروں نے تعجب سے سوال کیا: ''جان عالم بندر کون تھا اور اس کا قصہ کیا ہے۔''

دانشمند بندر نے کہا: ''جان عالم کے متعلق تحقیق نہیں کہ وہ کون تھا۔ میں نے بزرگ بندروں سے سنا ہے کہ وہ بندر تھا مگر قالب بدل کر آدمی بن گیا۔ مگر یوں

بھی سنا گیا ہے کہ وہ آدمی تھا اور قالب بدل کر بندر بن گیا تھا۔ بہر حال آدمی اور بندر ان دو مخلوقوں کی اصلیت ہمیشہ ادلتی بدلتی رہی ہے۔ کبھی آدمی بندر بن جاتے ہیں اور کبھی بندر آدمی بن جاتے ہیں۔ تو میں نے بزرگ بندروں سے یہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ بندروں کا بہت قتل عام ہوا۔ بندروں کا خون آدمی کے خون سے زیادہ ارزاں ہو گیا۔ اور بندروں کا بندر بن گیا۔ اسی قیامت میں جان عالم بندر پکڑا گیا اور اسے ہاتھی پہ بٹھا کر گشت کرایا گیا تاکہ خلقت پہلے اسے دیکھے پھر اسے قتل کیا جائے۔ اس نے کیا چالاکی کی کہ تقریر کرنی شروع کر دی۔ تین بوڑھے بندر کہ کسی نہ کسی طرح اب تک وزیرزادے کی زد سے بچے ہوئے تھے۔ ایک درخت پہ چھپے بیٹھے تھے۔ جلوس قریب آیا تو انہوں نے چپکے سے ٹہنیوں کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بندر ہاتھی پر سوار ہے۔ وہ بے ثباتیِ دنیا اور نیرنگیِ زمانہ پر مرصع اردو میں تقریر کرتا ہے اور لوگ سر دھنتے ہیں۔

ایک بندر نے کچھ حیران کچھ متاسف ہو کر کہا "اس بندۂ خدا کی تو جون بدلتی نظر آتی ہے۔ بالکل آدمیوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔"

دوسرے نے ٹھنڈا سانس لیا اور کہا: "یہ سب بندر لوگوں کے قومی زوال کی نشانیاں ہیں۔"

تیسرے نے تشویش بھرے لہجہ میں کہا: "اس لڑکے کے یہی لچھن ہیں تو یہ ہمارے نوجوانوں کو بھی خراب کرے گا۔"

پہلے نے مایوسانہ لہجہ میں کہا: "اب وہ ہم میں واپس کیا آئے گا۔ اس نے صنائع و بدائع کا فقروں میں استعمال سیکھ ہی لیا ہے۔ وہیں کہیں کسی درسگاہ میں معلم بن جائے گا۔ ادب پڑھائے گا یا فسانہ عجائب پر تحقیق کرے گا۔"

دوسرے بندر نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا بُرے بندروں کا برا انجام اور

آنکھیں بند کر لیں۔

دانشمند بندر کی زبان سے یہ قصہ سن کر سب بندر بہت متاثر ہوئے۔ مگر نوجوان بندر یوں گویا ہوا کہ "اے بزرگ بندر معلم بننے کے لیے پڑھا لکھا ہونا لازم ہے اور پڑھا لکھا بننے کے لیے کتابوں کا مطالعہ لازم ہے۔ بندر کہ کتاب نہیں پڑھ سکتے' معلم کیسے بن سکتے ہیں اور زبان اور ادب کیسے پڑھا سکتے ہیں۔"

دانش مند بندر نے اسے غور سے دیکھا اور کہا: "اے نوجوان کیا تجھے آج چنے نہیں ملے......؟"

نوجوان بندر نے کہا' مجھے تین دن سے چنے نہیں ملے ہیں۔"

دانش مند بندر بولا تب ہی تو ایسا سوال کرتا ہے۔ بندروں کو چنے کھانے کو نہ ملیں تو وہ سوالات کرنے لگتے ہیں۔ اے بندر زادے 'معلم بننے کے لیے پڑھا لکھا ہونا اور پڑھا لکھا کہلانے کے لیے پڑھا ہوا ہونا شرط نہیں۔ کیا تو نے الف لیلہ کے اہل قلم بندر کا قصہ نہیں سنا؟"

نوجوان بندر نے تعجب سے پوچھا' "اے ہمارے بزرگ الف لیلہ میں اہل قلم بندر کا قصہ کیونکر ہے؟"

تب اس دانشمند بندر نے کہا' اے بندر زادے' الف لیلہ میں اہل قلم بندر کا قصہ یوں رقم ہے کہ ایک جہاز ساحل سے کسی صورت حرکت نہ کرتا تھا۔ جب کپتان کی سمجھ میں جہاز کی کوئی خرابی نہ آئی تو اس نے مسافروں سے یوں خطاب کیا کہ دوستو اس جہاز میں کوئی ایسا سوار ہے جو اپنے مالک سے بھاگا ہے۔ پس سب اپنا نام و پتہ لکھیں کہ جو نام و پتہ نہ لکھے گا' اسے مشتبہ گردانا جائے گا اور اسے جہاز سے اتار دیا جائے گا۔ سب مسافروں نے بصد خوشی اپنا نام اور پتہ لکھ دیا۔ کپتان نے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی۔ پھر مسافروں کو شمار کیا۔ حساب درست پایا۔ پھر اس نے سارے جہاز پر نظر دوڑائی اس

وقت اس نے ایک گوشے میں ایک بندر کو بیٹھا ہوا پایا۔ اسے دیکھ کر کپتان کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے طے کیا کہ بندر کو جہاز سے اتار دیا جائے۔

بندر اس فیصلے سے بہت پریشان ہوا اور مانند آدمیوں کے ہاتھ پیر جوڑنے لگا۔ جب کوئی شنوائی نہ ہوئی تو اس نے چھلانگ لگا کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر اپنا نام و پتہ لکھ ڈالا۔ اس پر اہل جہاز نے دانتوں میں انگلیاں دابیں اور شور پڑا کہ کیا ماجرا ہے کہ بندر بھی اہل قلم ہونے لگے۔

تب اس نے اپنی داستان درد اس طرح سنائی کہ "عزیزو! میں تمہارے شہر کے ملک الشعراء کا بندر ہوں۔ اس نے مجھے جب میں بچہ تھا اس وقت سے پالا ہے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ جب وہ قصیدہ لکھنے بیٹھتا تو میں اس کی گود میں جا بیٹھتا اور اسے لکھتے ہوئے غور سے دیکھا کرتا۔ جب وہ باہر چلا جاتا تو اس کا قلم اٹھا کر اس کی طرح لکھنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز اس نے مجھے لکھتے ہوئے دیکھ لیا۔ میرے لکھے ہوئے قصیدے کو اس نے اپنے قصیدے سے بہتر پایا۔ اس پر وہ مجھ سے حاسد ہو گیا اور مجھے مارنے دوڑا۔ میں ڈر کر وہاں سے بھاگا اور تمہارے ہمراہ جہاز میں سوار ہو گیا کہ کسی اور شہر نکل جاؤں جہاں سخن کی قدر ہو اور میری روزی کا وسیلہ نکلے۔" اسی جہاز میں ایک صاحبِ قلم حکیم سفر کرتا تھا۔ اس نے یہ قصہ سنا تو متاسفانہ کہا: "اب بندر بھی اہل قلم ہوئے۔ لکھنے کا کیا لطف رہا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا قلم ٹکڑے ٹکڑے کیا اور سمندر میں پھینک دیا۔

دانشمند بندر نے یہ قصہ بندروں کو عبرت دلانے کے لیے بیان کیا تھا لیکن وہ بندروں کے قومی زوال کا زمانہ تھا اور قومی زوال کے زمانے میں ہر تعلیم الٹا اثر کرتی ہے۔ نوجوان بندر پر اس حکایت غریب کا عجب اثر ہوا کہ وہ جان عالم بندر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ وہ سوال کرتا "پھر جان عالم بندر کا کیا انجام ہوا؟"

"جان عالم بندر جان عالم شہزادہ بن گیا۔" دانشمند بندر کہتا۔

"بندر سے ایکاایکی شہزادہ بن گیا؟"

نوجوان بندر دانش مند بندر کے جواب سن کر دیر تک حیران رہتا اور جان عالم کے بندر کے قالب کو چھوڑ کر شہزادے کا قالب لینے کا تصور باندھا کرتا۔ اور اس نے جان عالم بندر کی اس پوری تقریر کو حفظ کر لیا تھا جو اس نے ہاتھی پر بیٹھ کر نیرنگی زمانہ پر کی تھی اور اس کی ساری رعایات لفظی کو سمجھ لیا تھا۔ وہ یکایک کسی اونچی شاخ پر پہنچتا اور ٹانگوں پر کھڑے ہو کر بفصاحت و بلاغت جان عالم کی تقریر دہرانے لگتا۔ "صاحبو! دنیائے دوں نیرنگی زمانہ سفلہ پرور بوقلموں عبرت و دید کی جا ہے۔ ہزار حیف کہ کمینوں کا چرخ حامی ہے۔ اس کی بدولت بندر آدمی اور آدمی بندر بن جاتے ہیں۔ معاملات قضاو قدر سے ہر ایک ناچار ہے۔ یہی مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ جسے دیکھا آزاد نہ پایا۔ کسی نہ کسی بکھیڑے میں مبتلا پایا۔ اس کی قدرت ناطقہ دیکھو مجھ سے بے زبان ناچیز کو یہ تکلف گویائی عنایت کیا۔ تم سب کا سامعوں میں چہرہ لکھ دیا۔ دنیا ایک زال بیسوا ہے۔ کل تک ہم بندر لوگ درخت درخت زقندیں بھرتے تھے اور اونچی شاخوں کے پھل توڑ کر کھاتے تھے۔ اب ہمارے بازو شل ہیں، پنجے گھس گئے، دانت کندہ چاقو بن گئے، آدمی کے فراہم کیے ہوئے گڑچنوں پر گذارہ ہے۔ کس و ناکس جنس ناپائیدار لہو ولعب کا خریدار ہے۔ اتنا نہیں سوجھتا کیا لین دین ہو رہا ہے۔"

بندر اس تقریر کو منہ کھولے ششدر بنے سنتے۔ پھر خوب ہنستے اور اسے آدمی کا نقال سمجھتے۔ مگر دانش مند بندر اسے دیکھ دیکھ کر مشوش ہوتا۔ اس کی پشت اور دم پر نظر ڈالتا کہ پشت سے اس کی بال کم ہوتے چلے جارہے تھے اور اس کی دم گھس کر آدھی رہ گئی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اب سب ہی بندروں کی دمیں چھوٹی ہو گئی تھیں اور ان کی پشت کے بال جھڑتے چلے جارہے تھے۔ ان کے پنجے گھس گئے تھے اور دانتوں

کا یہ عالم کہ آگے منہ بند کر کے بھی بیٹھتے تھے تو وہ بجتے رہتے تھے مگر اب چنے مشکل سے چبا سکتے تھے۔ دانش مند بندر انہیں دیکھتا اور دل میں سوچتا کہ اے بندروں کے مالک کیا بندر اتنا ذلیل ہو جائے گا کہ بے دم والا دو ٹنگا جانور بن جائے گا۔ کیا بندر نسل جس نے باغوں اور جنگلوں میں بندریت کا ڈنکا بجایا تھا' صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔

دانش مند بندر کے وسوسے صحیح ثابت ہوئے۔ ایک روز نوجوان بندر کے دماغ میں عجب سمائی کہ تقریر کرتے کرتے دانا دہقان کے پیچھے ہو لیا۔ دانش مند بندر نے لاکھ اسے پکارا کہ اے نوجوان کیوں جان کھوتا ہے' آدمی کے پیچھے ہوتا ہے۔ اپنی جوانی پہ رحم کھا۔ آدمیت کے اندھے کنوئیں میں گرنے سے باز آ۔ مگر اس نے مطلق نہ سنا اور چلتا چلا گیا۔ ایک بندر بچہ ذوق تجسس میں دور تک اس کے پیچھے گیا۔ واپس آکر اس نے بتایا کہ نوجوان بندر دہقان کے پیچھے جاتے جاتے آدمیوں کے ایک شہر میں داخل ہو گیا اور پھر دو ٹانگوں پہ کھڑا ہو کر چلنے لگا اور جب وہ دو ٹانگوں پر چل رہا تھا تو اس کی دم چھوٹی ہوتے ہوتے بالکل گمٹی کی مثال رہ گئی تھی۔

دانش مند بندر یہ سن کر دیر تک سر نیوڑھائے بیٹھا رہا۔ اس کی ناک پر مکھی آ بیٹھی تھی۔ اس نے زور سے چھینک لی اور اڑتی ہوئی مکھی کو دیکھ کر پہلے منہ کھولا' پھر ہاتھ مارا' پھر ناکام ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور بولا: "جو جن میں سے تھا ان کے ساتھ جا ملا۔"

دانش مند بندر نے بہت دیر بعد اپنی آنکھیں کھولیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ بندر بچہ کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کاغذ ہے اور بہت سے بندر اس کے ساتھ اس پر جھکے ہوئے ہیں۔ اس نے از راہ تشویش سوال کیا: "اے بد بختو یہ تمہارے ہاتھ میں کیا چیز آئی ہے؟"

بندر بچہ نے لہک کر کہا کہ "اے بزرگ بندر یہ اخبار ہے۔ جب میں نوجوان

بندر کے پیچھے شہر گیا تھا تو وہاں سے یہ لیتا آیا۔ اس میں نوجوان بندر کا بیان چھپا ہے۔''

دانش مند بندر نے یہ سن کر ہراس کے عالم میں سب بندروں کے چہروں کو غور سے دیکھا جن کی سرخی غائب ہو چکی تھی۔ پھر ان کی دموں پر نظر کی اور اٹھ کھڑا ہوا اور گویا ہوا:

''اے غافلو' اے بندر لوگو' اب کوئی طاقت تمہیں تمہارے انجام سے نہیں بچا سکتی!''

ایسا کہہ کر دانش مند بندر نے چھلانگ لگائی اور دوسرے درخت پر چلا گیا۔ پھر درخت درخت چھلانگیں لگاتا وہ کسی دوسرے جنگل میں نکل گیا اور جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوا تو مہابن کے بندروں نے دیکھا کہ ان کی دمیں چھوٹی ہوتی چلی جارہی ہیں اور اب وہ چار ٹانگوں پر نہیں چل سکتے اور وہ سب درختوں سے نیچے اتر آئے۔

میرے اور کہانی کے بیچ

اس روز میں نے افسانہ لکھنے کی نیت سے قلم اٹھایا تھا۔ ویسے تو میں یکسو ہو کر بیٹھا تھا۔ مگر اتفاق سے کمرے میں رکھا ہوا ٹی وی کھلا رہ گیا تھا۔ خیر میں ٹی وی کے نشہ بازوں میں سے نہیں ہوں۔ قبول عام حاصل کرنے والے ٹی وی پروگرام بھی مجھے کچھ نہیں کہتے۔ بیشک وہ جاری رہیں، کمرے میں میں ان سے بے تعلق رہ کر اپنے لکھنے یا پڑھنے کے کام میں مصروف رہ سکتا ہوں۔ مگر اس وقت صورت دوسری تھی۔ نہ کوئی سیریل چل رہا تھا نہ کوئی ہنسی دل لگی والا پروگرام۔ اس وقت ایک نہایت سنجیدہ پروگرام ہو رہا تھا۔ ایک ایسا قومی مظاہرہ جس میں ہماری قومی بقا کی ضمانت مضمر جانی گئی ہے۔ پاکستان کے ایٹمی تجربوں کی فلم چل رہی تھی۔ دھماکہ ہوا۔ زمین دوز گڑگڑاہٹ۔ پھر میں نے دیکھا کہ پہاڑ میں ہلکی سی لرزش ہوئی اس کے ساتھ ہی پہاڑ کی رنگت بدلنی شروع ہو گئی۔ کچھ اس طرح سے جیسے چہرے کا رنگ فق ہوتا ہے۔ اس آن میں نے قلم رکھ دیا۔ یا شاید وہ خود ہی چلتے چلتے رک گیا اور میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں قلم رکھ دوں۔ مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ جب سورج کو یا چاند کو گرہن لگتا تھا تو میرے والد اپنے باقی کام موقوف کر دیتے اور جانماز بچھا کر بیٹھ جاتے۔ اس وقت وہ وہ نماز پڑھتے

جسے وہ نماز خوف بتاتے تھے۔ کہتے کہ اس وقت چاند پر آزمائش کی گھڑی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ سے چاند کے لیے دعا کرنی چاہیے کہ اس کی مشکل آسان ہو اور آزمائش کی گھڑی خیریت سے گذر جائے۔ شاید اس وقت پاکستان کے ایک پہاڑ پر ایسی ہی آزمائش کی گھڑی آئی ہوئی تھی۔ اس بھاری وقت میں اس پہاڑ نے کمال ہمت سے کام لیا کہ وہ دھماکہ جو تباہی اپنے جلو میں لے کر آیا تھا اس سب کو اس نے اپنی جان پر لے لیا اور پاکستان کے جانداروں کو گزند نہیں پہنچنے دیا۔ اسے اس عالم میں کس اذیت سے گذرنا پڑا اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ یہ اذیت جھیلتے ہوئے وہ پہاڑ لرز اٹھا اور اس کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اب اس کا اپنا قدرتی رنگ کبھی واپس نہیں آئے گا۔

ایٹم بم کل تک ہمارے لیے دور کی شے تھا' ایک نادر و نایاب قیامت خیز ہتھیار جو سمندر پار کی بڑی طاقتوں کے اسلحہ خانوں کی زینت تھا۔ چشم زدن میں وہ ہمارے ہاتھوں میں آ گیا۔ عجب 'ثم العجب۔ تو اب ہم ایٹمی طاقت ہیں۔ ایٹمی طاقت تو بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور بڑی طاقت کون بننا نہیں چاہتا۔ سو ہندوستان کے لوگ بہت خوش ہیں۔ پاکستان کے لوگ بھی بہت خوش ہیں۔ فکر مند بڑی طاقتیں ہیں۔ انہوں نے آپس میں بہت عہد معاہدے کیے تھے کہ چاہے کچھ ہو جائے ہم یہ ہتھیار استعمال نہیں کریں گے۔ اب وہ پریشان ہیں کہ یہ تو بندروں کے ہاتھ میں استرا پہنچ گیا ہے۔ ان کا کیا اعتبار کب بٹن دبا دیں اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو لے ڈوبیں۔

مجھے ان دنوں کتنی کہانیاں یاد آ رہی ہیں جو میں نے بچپن میں اپنی نانی اماں سے سنی تھیں۔ ایک کہانی اس طرح تھی کہ ایک شہزادہ قسمت کا مارا ایک دیو کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس دیو کا اپنا ایک عالیشان قلعہ تھا۔ شہزادے کو لے جا کر اس قلعہ میں چھوڑ دیا اور ہدایت کی کہ اس قلعہ کے اندر تو ہر طرح آزاد ہے۔ یہاں سات در ہیں۔ چھ در کھولنا۔ ان میں طرح طرح کی نعمتیں ہیں۔ ان نعمتوں کے مزے لوٹنا۔ لیکن ساتواں در

مت کھولیو۔ وہ کھولے گا تو تو اپنے سر تباہی لائے گا۔ شہزادے نے کتنے دنوں اس ہدایت پر عمل کیا۔ چھ دروں میں سے جو در کھولتا اسے نعمتوں سے مالامال پاتا۔ ہر طرح کی لذت ہر طرح کے عیش۔ مگر آخر اس کی ان لذتوں سے نیت بھر گئی۔ ایک دن اس کے دماغ میں کیا سمائی کہ ساتواں در کھولو اور دیکھو کہ وہاں کونسی نعمتیں ہیں۔ ساتویں در کا کھولنا تھا کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

ہمارا زمانہ بھی ایک دیو کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کا دیو۔ چھوٹے ملکوں میں کیا پتہ چلتا ہے۔ مغرب کے بڑے ملکوں میں جا کے دیکھو۔ سچ مچ یہی لگتا ہے کہ کہیں الہ دین کے چراغ سے دیو نے نکل کر یہ عالیشان قلعہ تعمیر کیا ہے۔ جس در کو کھولو ایسی نعمتوں اور آسائشوں سے مالامال نظر آئے گا کہ عقل دنگ رہ جائے۔ مگر اس قلعہ میں ایک ساتواں در بھی اب نمودار ہو گیا ہے۔ ویسے تو جنات نے یہی طے کیا ہے کہ ہم اپنے اپنے قلعہ کے سب در کھولیں گے مگر ساتواں در نہیں کھولیں گے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ اگر کسی گھڑی کسی سنکی شہزادے کے دماغ کی پھر کی گھوم گئی اور اس نے ساتواں در کھول دیا تو......

بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور میں تکیہ کرتا ہوں پرانی کہانیوں پر دیومالائی قصوں پر۔ یار کہتے ہیں کہ یہ پرانی قصہ کہانیاں' یہ دیومالائیں انسانیت کے بچپن سے یادگار ہیں جب آدمی کی عقل کچی تھی اور اوہام کا دور دورہ تھا۔ اب عقل و شعور کا چلن ہے اور سائنس کا زمانہ ہے۔ اور میں پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی بچہ بالغ ہو گیا ہے۔ سنا تو یہی ہے کہ مغرب میں سائنس اور فلسفہ کی گود میں پل کر وہ خیر سے بالغ ہو گیا ہے اور عقل کا پتلا بن گیا ہے۔ ایٹم بم بھی اسی کی عقل کی کارستانی ہے مگر ہیروشیما بھی تو اسی کے شعور کا کرشمہ ہے۔

خیر تو اب عقل و شعور کا دور دورہ ہے اور ٹیکنالوجی اپنے عروج پر ہے اور

جنگل صحرا سمندر پہاڑ چرند پرند سب بہت مصیبت میں ہیں۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ بھائی یہ تو تسخیر فطرت کا عمل ہے اور پھر اقبال کے شعروں سے اس عمل کے حق میں دلیلیں لاتے ہیں۔ اتفاق سے اقبال کے شعر جہاں تہاں سے مجھے بھی یاد ہیں۔ دو شعر حاضر خدمت ہیں:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

بلکہ زندگی کی شب تاریک تو اس کے بعد اور تاریک ہو گئی۔ ہوتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اگر کہیں امید کی کرن باقی بھی رہ گئی تھی تو اسے ایٹم بم نے آ کر بجھا دیا۔

لیجیے یہ تو میں اپنے پرانے رونے گانے پہ آ گیا۔ اور اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ یہ میرا رونا گانا کب سے شروع ہوا۔ 1960ء کی دہائی کے اوائل میں جب پنجاب یونیورسٹی کے گیٹ کے برابر کھڑا بلند و بالا پیپل کا پیڑ کاٹا گیا تو مجھے یوں لگا کہ شہر میں قتل کی کوئی واردات ہو گئی ہے اور بستی کے سر سے کسی ولی کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ میں نے آتے جاتے کب کب اس گھنے پیڑ کی چھاؤں میں نوخیز طلبا اور طالبات کو چہکتے مہکتے دیکھا تھا۔ اس چہک مہک کے پیچھے کیا کہانیاں تھیں وہ تو اس درخت ہی کو معلوم تھیں۔ وہ اب ان ساری کہانیوں کو اپنے سینے میں چھپائے مال پہ اوندھا پڑا تھا۔ میں ان دنوں "مشرق" میں کالم نگاری کرتا تھا۔ سیاسی مسائل سے منہ موڑ کر بس لوگوں، درختوں، پرندوں کے چھوٹے موٹے معاملات پر لکھا کرتا تھا۔ سو اس شہادت پر بھی ایک کالم قلمبند کیا۔ پھر حلقہ ارباب ذوق کے جلسہ میں جا کر دہائی دی۔ ان دنوں حلقہ کے جلسوں میں رجعت پسند اور ترقی پسند دونوں قسم کے ادیب مل بیٹھ کر ادبی مسائل پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ رجعت پسند

ادیبوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک درخت کے کٹنے کو ایک انسانی واردات اور ایک ادبی مسئلہ بنا کر کیوں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادھر ترقی پسند دوستوں نے میری فریاد کو عین رجعت پسندی اور ترقی دشمنی قرار دیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ پاکستان صنعتی عہد میں داخل ہو رہا ہے۔ سو درخت تو کٹیں گے۔ اس کے بغیر ملک ترقی کیسے کرے گا۔

بس پھر شہر میں درخت اندھا دھند کٹتے چلے گئے۔ اور ایک روز مجھے ایک عجب فون آیا۔ بیگم حجاب امتیاز علی بول رہی تھیں "انتظار صاحب کیا آپ کو اس کا پتہ ہے کہ اب کے برس کوئل اس شہر میں خاموش ہے۔ جون شروع ہو چکا ہے اور ابھی تک کسی طرف سے کوئل کی کوک سنائی نہیں دی۔ آپ بتایئے آپ نے کوئل کی کوک سنی ہے۔"

میں نے جناح باغ میں اپنی صبح کی سیروں کو یاد کیا اور حیران ہوا کہ کوئل کے کوکنے کا موسم تو شروع ہے۔ مگر ابھی تک قریب یا دور سے اس کی کوک سنائی نہیں دی ہے۔ مگر مجھے اس کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔

"آپ بجا فرماتی ہیں۔ میں نے بھی ابھی تک کوئل کی کوک نہیں سنی ہے۔"

"پھر آپ نے اس پر کالم کیوں نہیں لکھا۔ لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہونا چاہیے۔ انتظار صاحب، لکھیے۔ لوگوں کو بتایئے کہ یہ بہت تشویش کی بات ہے۔ تو آپ لکھیں گے۔"

"جی لکھوں گا۔"

یہ واقعہ یقیناً ایسا تھا کہ اس پر لکھنا چاہیے تھا۔ اور یہ واقعہ میری تو سمجھ میں آتا تھا۔ آخر درختوں کے قتل عام پر عالم فطرت کے کسی گوشے سے تو احتجاج ہونا تھا۔ یہ احتجاج کوئلوں کی طرف سے ہوا۔ ہمارے یہاں احتجاج کوئلوں کی طرف سے ہوا۔ اور اس طرح ہوا کہ انہوں نے چپ سادھ لی اور ہمیں اپنی سریلی آواز سے محروم کر دیا۔ اور ابھی مجھے "سویرا" کا تازہ شمارہ موصول ہوا ہے۔ صلاح الدین محمود نے اپنے مضمون

میں بتایا ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں چڑیاں، تتلیاں اور مچھلیاں اجتماعی خودکشی کر رہی ہیں۔ ناصر کاظمی نے کہا تھا:

اڑ گئے یہ شاخ سے کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

مگر اب وہ اڑ کر کہاں جائیں۔ آدمی کے ہاتھوں ساری دنیا کی ہوا میں زہر گھل چکا ہے۔ چڑیاں اور تتلیاں ظالم و جاہل آدمی کے ہاتھ کو نہیں پکڑ سکتیں کہ ہوا میں زہر مت گھولو اور اللہ کی زمین پر زندگی کو اجیرن مت بناؤ۔ وہاں تو مقدور اتنا ہی ہے کہ کوئلیں ناخوش ہو کر کوکنا بند کر دیں۔ چڑیاں اور تتلیاں اس مسموم فضا سے بیزار ہو کر خودکشی کر لیں۔ ایک حساس تتلی اور ایک چہکتی چڑیا انسان کے ظلم و جہل کا ویسے تو کوئی جواب دے نہیں سکتی۔ اس کے پاس تو کوئی Deterrent نہیں ہے۔

مگر پھر وہی بات کہ ہمارے رونے گانے سے کیا ہوتا ہے۔ ارے ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ اب تو کلنٹن صاحب کی کوئی نہیں سنتا۔ وہ ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔ کس نے ان کی سنی۔ ہندوستان اور پاکستان کی ایٹمی دھوں دھاں میں امریکہ کی خوں خاں دھواں بن کر اڑ گئی زمانے کا یہ انقلاب بھی دیدنی ہے۔ ہم نے پاکستان میں دو بڑوں کے رعب میں آنکھ کھولی تھی۔ دونوں سپرپاور۔ دونوں کا جلال الاماں۔ چھوٹی قومیں دونوں کے جلال سے پناہ مانگتی تھیں۔ کوئی چھوٹی قوم ایک کی معتوب ہوتی تو سہم کر دوسرے کے دامن میں پناہ ٹٹولتی۔ دوسری لال پیلی نظروں سے دیکھتی تو پہلی کی آغوش میں چلی جاتی اور اپنے تئیں محفوظ جانتی۔

سوویت روس کے ڈھے جانے سے رعب داب کا یہ توازن بگڑ گیا۔ معلوم ہے دبیرؔ کے انتقال پر انیسؔ نے کیا کہا تھا۔ افسوس سے کہنے لگے کہ اب مرثیہ کہنے کا لطف جاتا رہا۔ ٹھیک کہا۔ شعر و ادب ہو، سیاست ہو، اکھاڑہ ہو، کرکٹ کی فیلڈ ہو، کوئی

بھی میدان ہو صاحب کمال کے جوہر اسی صورت کھلتے ہیں اور اسی صورت اس کا دبدبہ قائم رہتا ہے کہ مقابل میں کم و بیش اتنا ہی بڑا صاحب کمال ہو۔ امریکہ نے اس نکتہ کو سمجھا نہیں۔ تو پھر کیا ہوا۔ آگے تو نافرماں بردار بچے نافرماں برادری کے بعد بھی فرماں بردار رہتے تھے۔ ایک بڑے کے حکم کی نافرمانی کرتے تھے تو دوسرے کے فرماں بردار بن جاتے تھے۔ فرماں برداری کی وضع بہر حال قائم رہتی تھی۔ مگر اب تو لے دے کے ایک ہی بڑا رہ گیا ہے۔ جو اس کی حکم عدولی کرے گا وہ پھر کس کا کہنا مانے گا۔ تو اب بچے بے کہنے ہو گئے ہیں 'سرکشی بڑھتی چلی جارہی ہے مگر کس طرح'۔ آگے تو بائیں بازو کے دانشوروں نے سرکشی پر کمر باندھی ہوئی تھی۔ اس سرکشی کی عجب صورت تھی کہ اس کے طفیل بائیں بازو کے دانشور کو ایک وقار حاصل ہو جاتا تھا۔ اور ادھر امریکہ کا دبدبہ بھی بدستور قائم رہتا تھا۔ اب یہ مخلوق پاکستان میں ناپید ہے۔ سوویت روس کے زوال کے بعد پوری دنیا ہی میں یہ جنس کمیاب ہو گئی ہے۔ مگر اس سے امریکہ کو کیا فائدہ پہنچا۔ نہیں' بلکہ الٹا نقصان پہنچا۔ امریکہ دشمنی کا فریضہ مولوی ملاؤں نے سنبھال لیا۔ اس سے ہوا یہ کہ اس سے مولوی ملاؤں کو تو وہ بائیں بازو کے دانشور والا وقار حاصل نہیں ہوا۔ مگر امریکہ بے وقار ہو گیا۔ اس کا جو رعب داب تھا یا دلی کے کرخنداروں کے محاورے میں جو رعاب شعاب تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس فرق کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ تحریک مزاحمت میں جو بائیں بازو والوں کا طریقہ واردات تھا۔ بڑی طاقت کا دبدبہ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقہ پر کم ہوتا چلا جاتا۔ اسی تناسب سے مزاحمت کرنے والوں کا وقار بڑھتا چلا جاتا۔ دہشت گردی بنیاد پرست گروہ کا طریقہ واردات ہے۔ بڑی طاقت کا رعاب شعاب دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔ مگر دہشت گردوں کو وقار حاصل نہیں ہوتا۔ بس ان کی دہشت دلوں پر بیٹھ جاتی ہے۔

خیر تو یہ کہہ رہا تھا کہ بچے بے کہنے ہو گئے ہیں 'سرکشی بڑھتی چلی جارہی ہے اور

جو بڑے بنے بیٹھے تھے ان کا دبدبہ قائم نہیں رہا۔ ایسے میں ایٹم بم چھوٹوں کے ہاتھوں میں آگیا تو کیا گل کھلائے گا۔

خیر آگے کیا ہوگا' یہ تو حالات بتائیں گے۔ فی الحال تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے۔ مگر دیکھیے اسی ہنگام ہمارے دوست انور سجاد نے کیا شگوفہ چھوڑا ہے۔ عین اس وقت جب پیپلز پارٹی والے لوگوں کو یاد دلا رہے تھے کہ ایٹم بم کے کام کا آغاز اصل میں بھٹو صاحب نے کیا تھا تو انور سجاد نے اپنی تحقیق سے یہ انکشاف کیا کہ پاکستان کے لیے ایٹم بم کا خواب سب سے پہلے منٹو صاحب نے دیکھا تھا۔ حوالہ ان تحریروں کا دیا جو منٹو صاحب نے چچا سام کے نام خطوط کی صورت میں لکھی تھیں۔ یہ مضمون اس یار نے ایک اخبار کی طرف سے ہونے والے ایک مذاکرے میں پڑھا اور ازراہ عنایت مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ میں نے یہ مضمون پڑھا اور ورطۂ حیرت میں غرق ہوا کہ اچھا منٹو صاحب نے ایسا خواب بھی دیکھا تھا۔ انور سجاد کا کہنا تھا کہ منٹو صاحب کا یہ خواب کسی صاحب عمل کا منتظر تھا۔ اس صاحب عمل نے ذوالفقار علی بھٹو کی صورت میں ظہور کیا جس نے اس خواب کو جامۂ عمل پہنایا۔

مجھے چچا سام کے خطوط ایک مرتبہ پھر پڑھنے پڑے۔ اور یہ خطوط پڑھ کر میں نے ایک مرتبہ پھر دریائے حیرت میں غوطہ لگایا۔ یہ غوطہ انور سجاد کے نام کا تھا۔ منٹو صاحب نے کیا لکھا تھا اور اس عزیز نے کیا سمجھا۔ منٹو صاحب انور سجاد برانڈ کا تجریدی افسانہ تو نہیں لکھتے تھے کہ جس کے جیسے مزاج میں آیا ویسے معنی نکال لیے۔ وہاں تو سیدھا سادھا طنزیہ انداز ہے۔ چچا سام سے پوچھا جا رہا ہے کہ یہ ہائیڈروجن بم کیوں بنایا جا رہا ہے۔ کس کس ملک کو صفحۂ ہستی سے مٹانا مقصود ہے۔ اور اگر یہ ہے تو ایک چھوٹا سا ایٹم بم اپنے بھتیجے کو بھی عنایت ہو۔ وہ استنجے کے ڈھیلے والوں سے بہت تنگ ہے۔ ان کا قصہ چکا دیا جائے۔ لیجیے مجھے تقسیم سے فوراً پہلے کی بنی ہوئی بمبئی کی ایک فلم ''آٹھ دن'' یاد

آ گئی۔ منٹو صاحب نے اس میں کام کیا تھا۔ شاید اس کا اسکرپٹ بھی انہوں نے ہی لکھا تھا۔ انہوں نے ایک ایسے نیم دیوانے کا کردار ادا کیا تھا جس کے ہاتھ میں ایک گولا ہے۔ اسے وہ ایٹم بم بتاتا ہے اور بار بار دھمکی دیتا ہے کہ کہو تو ایٹم مار دوں۔ اس فلم کے خیال نے مجھے اور ڈرا دیا۔ خیر میں تو بزدل ہوا۔ ویسے اس وقت برصغیر کے لوگ بالعموم ایٹم بم کے سحر میں ہیں۔ بعض کے یہاں اندیشہائے دور دراز ہیں۔ مگر بہت سے ایسے ہیں جو خوش ہیں کہ کیا شئے مٹھی میں آئی ہے۔ تو ذہنوں پر اثرات الگ الگ قسم کے ہیں۔ مجھ پر اثر یہ ہوا کہ افسانہ نہیں لکھ پا رہا۔ انور سجاد پر دوسرے ہی قسم کا اثر ہوا۔ عجب، ثم العجب...... اس نے مارکسی انقلاب کو سلام کیا اور نظامِ محمدی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اس مضمون میں اس نے قوم سے اپیل کی ہے کہ ہم ایٹمی طاقت تو بن گئے ہیں۔ اب ہمیں پاکستان کو محمدی فلاحی مملکت بنانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ ع

یہ انقلاب مبارک ہو مومنوں کے لیے

مگر یہ دیکھیے کہ اس نئی صورت حال میں بھی انور سجاد نے اپنے لیے ایک بڑا مقصد تلاش کر لیا۔ میں پھر پیچھے رہ گیا۔ مجھے کہانی لکھنے کے چھوٹے سے مقصد سے آگے کوئی مقصد ہی نظر نہیں آتا۔ اور اب میری کہانی بھی ایک بحران سے دوچار ہے۔ جب قلم اٹھاتا ہوں تو وہی چاغی کا پہاڑ میری آنکھوں کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ پہلے اس میں ہلکی سی لرزش ہوتی ہے۔ پھر اس کا رنگ متغیر ہونے لگتا ہے۔ اس پہاڑ سے ہر تھوڑے عرصے کے بعد ایک پکار سنائی دیتی ہے جس سے لوگوں پر ایک ہیبت ہو جاتی ہے۔ پوری بستی کوہِ ندا کی ہیبت میں سانس لے رہی ہے۔ یہاں کوئی پکار سنائی نہیں دیتی۔ بس اچانک پہاڑ کا رنگ متغیر ہونے لگتا ہے۔ مگر مجھ پر تو اس کا اثر وہی کوہِ ندا کی پکار والا ہوتا ہے۔ تو میری صورت یہ ہے کہ ایٹم بم کے سحر میں نہیں ہوں۔ میں اس پہاڑ کی اذیت بھری ہیبت میں سانس لے رہا ہوں۔ اس اذیت سے لبریز ہیبت سے نکلوں تو کہانی لکھوں۔ میرے اور کہانی کے بیچ یہ درد رسیدہ پہاڑ آن کھڑا ہوا ہے۔

شہر زاد کے نام

میری کہانی ان دنوں مشکل میں ہے۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو ادبدا کر کوئی واردات گذر جاتی ہے۔ خبر ملتی ہے کہ فلاں مسجد پر دہشت گردوں نے ہلہ بول دیا۔ منہ پر ڈھاٹے باندھے کلاشنکوفوں سے مسلح داخل ہوئے اور نمازیوں کو بھون ڈالا۔ یا یہ کہ امام بارگاہ پر حملہ ہو گیا۔ دم کے دم میں عزاخانہ مقتل بن گیا۔ یا یہ کہ فلاں لاری کے اڈے پر بم پھٹ گیا اور آتے جاتے مسافروں کے پرخچے اڑ گئے۔ بس ذہن پراگندہ ہو جاتا ہے۔ کہانی ہرن ہو جاتی ہے اور قلم رک جاتا ہے۔

مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ میں کیا بیچتا ہوں اور میری کہانی کس گنتی میں ہے۔ اس عذاب میں تو ساری خلقت مبتلا ہے۔ تشدّد کا بول بالا ہے۔ دہشت گردوں کی بن آئی ہے۔ ہم آپ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔ انہوں نے تو سپر پاور امریکہ میں جا کر ایسا اودھم مچایا اور وہ تباہی پھیلائی کہ پورا امریکہ تراہ تراہ پکار اٹھا اور دنیا میں کھلبلی مچ گئی ۔

کودا ترے گھر میں کوئی یوں دھم سے نہ ہو گا
وہ کام کیا ہم نے کہ رستم سے نہ ہو گا

جواب میں امریکہ نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ وہ سیر تو یہ

سوا سیر۔ یہ نقشے دیکھ کر وہ قدیم زمانے یاد آتے ہیں جب وحشی قبائل اچانک ان شہروں پر جو تہذیب کے گہوارے سمجھے جاتے تھے' آن پڑتے تھے اور تہذیب و تمدن کے ان آشیانوں کو اجاڑ دیتے تھے۔ وہ قدیم زمانے کے وحشی تھے۔ اب ہم نئی بربریت کے زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔ خیر سے اسے ٹیکنالوجی کی کمک حاصل ہے۔ اس زور پر اس نے کیا زور باندھا ہے کہ قدیم وحشی نئے وحشیوں کے سامنے بچے نظر آتے ہیں۔ ایٹم بم تو دور کی بات ہے ان کی دسترس میں تو کلاشنکوف بھی نہیں تھی۔

نئے وحشیوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ایک اور کمک بھی حاصل ہے۔ نظریے کی کمک۔ قدیمی وحشی محض اور صرف وحشی تھے۔ وحشیت پر ملمع چڑھانا انہیں نہیں آتا تھا۔ ہمارے نئے زمانے کے وحشیوں نے اپنی وحشیت کو ایک نظریاتی شان عطا کرنے میں کمال حاصل کیا ہے۔ دہشت گردی سے لے کر جنگ تک تشدد کی ہر شکل کے لیے کوئی نہ کوئی اخلاقی جواز پیدا کر لیا جاتا ہے۔ قوم پرستی' نسل پرستی' مذہب ایسے تصورات سے تشدد کے مظاہرے وابستہ کر دیے جائیں تو ان کو ایک اخلاقی جواز حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اگر ایک دہشت گرد یہ کہہ کر نمازیوں پر گولیاں برساتا ہے کہ یہ مسلمان نہیں اصل میں کافر ہیں تو پھر یہ دہشت گردی نہیں رہتی' کار ثواب بن جاتی ہے۔

تو ہمارا زمانہ خالی دہشت گردی کا زمانہ نہیں ہے۔ نظریے سے مسلح دہشت گردی کا زمانہ ہے۔ ابھی پچھلی صدی میں ایسا زمانہ گذرا ہے جب انقلاب کے نام پر ہر قسم کے تشدد کو روا سمجھا جاتا تھا۔ اب مسلمانوں میں ایسے گروہ سر اٹھا رہے ہیں جو اسلام کا نام لے کر دہشت گردی کرتے ہیں۔ وہ انقلابی تشدد تھا۔ اس تشدد کو کیا نام دیا جائے۔

ایسے میں لکھنے والا کیا کرے۔ نہیں' میں کیا کروں' میری کہانی کیا کرے۔ واحد متکلم کا صیغہ میں نے یہ سوچ کر استعمال کیا کہ ادب میں مشترکہ فیصلے نہیں ہوتے۔

ہر لکھنے والا اپنے فن اپنے تخلیقی تجربے کے سلسلہ میں اکیلا جواب دہ ہوتا ہے۔ موت اور تخلیقی تجربہ ان دو کے روبرو آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ موت سے تو خیر ہر فرد بشر کو پالا پڑتا ہے۔ تخلیقی تجربے کی تنہائی اہل فن کی تقدیر میں لکھی گئی ہے تو جیسے ہر فرد موت کے روبرو اکیلا ہوتا ہے بس ویسے ہی ہر لکھنے والا اپنے تخلیقی تجربے کے روبرو اکیلا ہوتا ہے۔ایک ادیب کی حیثیت سے اسے بہت سے فیصلے اکیلے کرنے پڑتے ہیں مگر بیسویں صدی میں جو نظریاتی تحریکیں چلیں انہوں نے ادب کو لپیٹ میں لے لیا اور کوئی تحریک انفرادی فیصلہ کی اجازت نہیں دے سکتی۔ان تحریکوں کے اثر میں آنے والے ادیبوں کو یہ اجازت کیسے ملتی۔اور کیوں ملتی؟

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے

شعر افسانے کا معاملہ بھی آہ کا سا ہے اور وہ معشوق ہو یا جابر حاکم ہو' آہ بالعموم بے اثر رہتی ہے۔ پھر ایک بات بھرتری ہری نے کہی اور اقبال نے اسے دہرایا ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

مورکھوں پر کومل بول اثر نہیں کرتے۔

ایسی صورت میں نظریہ ساز اور ان کی تحریکیں ادب پر اعتبار کیسے کرتیں اور ادیبوں کو کھلا کیسے چھوڑ دیتیں۔ تو ادیبوں کے لیے مشترکہ لائحہ عمل مرتب کیے گئے اور لکھنے کے نئے نئے نسخے' ایسے لکھو اور ایسے مت لکھو۔ سعادت مند ادیبوں نے ان کا کہنا مانا۔ عہد کے مسائل پر بتائے ہوئے نسخہ کے مطابق مل جل کر لکھا مگر اس ادب کا بھی اثر کتنا ہوا پھر کیا ہو۔ ع

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

نوا کو تلخ تر کیا' تند تر' تیز تر' اتنا کہ وہ نغمہ کی حد سے نکل کر نعرہ بن گئی۔

تحریکوں کو اور کیا چاہیے تھا۔ جلسے، جلوس، اخباری بیانات ع

یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

جنگ کے خلاف، ایٹمی دھماکوں کے خلاف، دہشت گردی کے خلاف مہمات چلائی گئیں۔ ادیبوں، دانشوروں نے امن مارچ کیے، نعرے لگائے، تقریریں کیں، اخباری بیانات جاری کیے۔

اچھا ہوا۔ ظلم کے خلاف آواز تو اٹھنی ہی چاہیے۔ آہ کا اثر نہیں ہوتا تو پھر چیخو، نعرہ لگاؤ مگر میری کہانی پھر بھی مشکل میں ہے ع

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

میں تو کہانی ہی لکھ سکتا ہوں۔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے۔ نعرہ نہیں لگا سکتا اور کہانی نہ دہشت گردی اور ایٹمی دھماکوں کے ماحول میں لکھی جا سکتی ہے نہ ان کے خلاف نعروں کے ماحول میں۔ یعنی دوسری صورت میں بھی کہانی تو نہیں لکھی جائے گی۔ نعرہ ہی لکھا جائے گا مگر نعرہ تو لگانے کی چیز ہے۔ لکھنے کی نہیں۔ لکھا جائے گا تو خود بھی خراب ہوگا۔ شعر و افسانے کو بھی خراب کرے گا۔ افسانے کو زیادہ۔ شاعری تو ایسی بھی ہوتی ہے جو نعرے ہی کے زور پر چمکتی گرجتی ہے مگر کہانی ایسی چھوئی موئی ہے کہ نعرے کا پرچھاواں بھی پڑ جائے تو مرجھا جاتی ہے۔

پھر کہانی کیا کرے۔ ایک طرف جنگ ہے، دہشت گردی ہے، بنیاد پرستی ہے، کلاشنکوف ہے، ایٹمی دھماکے ہیں، نظریات ہیں، جن کی چھتری میں یہ سرگرمیاں اخلاقی جواز حاصل کرتی ہیں۔ دوسری طرف اس کے خلاف نعرے ہیں، خطبے ہیں، تقریریں ہیں۔ چکّی کا ایک پاٹ وہ، دوسرا پاٹ یہ۔ چلتی چکی دیکھ کے کبیر رویا اور میرا قلم رک گیا۔ دمشق میں اس سے بھی بڑھ کر ہوا تھا۔ وہاں تو عشق کا باب ہی بند ہو گیا تھا۔ ایسی قیامت کا قحط پڑا کہ یار عشق و عاشقی بھول گئے۔ مگر جہان آباد میں کیا ہوا۔ کبیر رویا تھا۔

سودا نے زہر خند کیا۔

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار

مغل شہسواروں کے برق رفتار گھوڑوں کا اب یہ حال ہو گیا تھا۔ بس ان گھوڑوں سے ان کے حال کا قیاس کر لو۔ دلی شہر ایک آشوب سے دو چار تھا۔ سودا نے اس آشوب کو بیان کیا اور خلاصہ یوں کیا۔

آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہتے ہیں کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گوینده ہی کا محض گماں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغہ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

اس سے میں نے اپنے زمانے پر قیاس کیا۔ جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے۔ کہیں نہیں۔ صحیح کہا کہ آسودگی کا تو بس نام رہ گیا ہے۔ آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے۔ یہ تو وہی سودا والا زمانہ واپس آ گیا۔ اس سے بھی برا' نئے بٹ مار' نئے قزاق' لوٹیں ہیں دن رات بجا کر نقارہ۔ نفرت کا بول بالا' حرف محبت عنقا' کلام نرم و نازک بے اثر' کیسی شاعری' کہاں کی کہانی' دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے۔ کبیر رویا' سودا نے زہر خند کیا' ادھر قلم رک گیا۔ اب میں دبدا میں ہوں۔ اسی قسم کی دبدا جو داستانوں کہانیوں میں وقتاً فوقتاً مہم جو شہزادے کو آلیتی ہے کہ پیچھے کھائی' آگے

سمندر، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ پھر کیا کیا جائے۔ بس اچانک خواجہ خضر نمودار ہوتے ہیں کہ میری انگلی پکڑ اور چل۔ یا کوئی غیبی آواز آتی ہے کہ لوح کو پڑھ اور جو اس میں لکھا ہے اس پر عمل کر۔ میرے پاس کون سی لوح ہے۔ ہاں ہاں ہے۔ الف لیلہ، میرے پاس یہی لوح ہے۔ لوح کہو، فکشن کا اسم اعظم کہو اور یہ اب کون سی آواز آئی جیسے سنی ہوئی ہو۔ ارے یہ تو الف لیلہ کے ورقوں کے بیچ سے آرہی ہے۔ بالکل شہرزاد کی آواز ہے۔ کیا کہتی ہے۔ کچھ بھی نہیں کہتی۔ نہ کوئی ہدایت، نہ کوئی پیغام، نہ کوئی فلسفہ نہ کوئی نظریہ۔ بس کہانیاں سنائے چلی جارہی ہے۔ ایک کہانی، دوسری کہانی، تیسری کہانی۔ سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہیں آرہا۔ اے وزیرزادی، اے کہانیوں کی ملکہ، ایسے وقت میں تمہیں کہانیوں کی سوجھی ہے۔ جان کی خیر مانگو۔ یہ سب رات رات کا کھیل ہے۔ صبح ہوئے پر تمہاری گردن ہوگی اور جلاد کی تلوار۔ یہ سر بھی اسی طرح قلم ہو جائے گا جیسے پچھلی ظلم کی صبحوں میں کتنی حسینوں مہ جبینوں کا تم سے پہلے ہو چکا ہے۔ شہریار بادشاہ نے عجب وطیرہ پکڑا تھا کہ روز شام کو ایک کنواری کو محل میں لاتا، رات اس کے ساتھ بسر کرتا، صبح ہوئے پر اس کا سر قلم کرا دیتا۔ شہرزاد کے سر میں کونسا پھوڑا نکلا تھا کہ خود اپنی مرضی سے باپ سے ضد کر کے ڈولی میں بیٹھ اس نحوست بھرے محل میں آن اتری۔ آکر اس نے کیا کیا، کچھ بھی نہیں کیا۔ بس کہانی سنانی شروع کر دی۔ شب عروسی ہے اور دلہن چھپر کھٹ پہ بیٹھی کہانی سنا رہی ہے۔ رات کہانی میں بیت گئی۔ جب صبح کا تارا جھلملایا اور مرغ نے بانگ دی تو شہرزاد بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ بادشاہ نے بے چین ہو کر پوچھا، پھر کیا ہوا۔ بولی، اب تو صبح ہو گئی۔ کہانی دن میں تھوڑا ہی کہی جاتی ہے۔ کوئی غریب مسافر رستے میں ہوا تو رستہ بھول جائے گا۔ رات ہو جانے دو پھر بتاؤں گی کہ آگے کیا ہوا۔

بادشاہ نے دل میں کہا، چلو ایک رات کی مہلت اور سہی۔ کہانی پوری ہو لینے

دو۔ تو رات آئی اور شہر زاد نے کہانی جہاں چھوڑی تھی وہاں سے سرا پکڑا اور سنانی شروع کر دی مگر کہانی کے بیچ پھر صبح کا تارا جھلملایا، پھر مرغا بول پڑا اور کہانی پھر ایک نازک موڑ پر آ کر تھم گئی۔ پھر وہی سوال کہ پھر کیا ہوا اور پھر وہی جواب کہ اب تو مرغے نے بانگ دے دی، صبح ہو گئی۔ باقی بشرط حیات رات کو۔

اسی میں راتیں گذرتی چلی گئیں اور کہانی سے کہانی نکلتی چلی گئی۔ ہزار بار صبح ہوئی اور ہزار بار مرغے نے بانگ دی۔ ایک ہزار ایکویں رات میں کہیں جا کر کہانی ختم ہوئی مگر اس عرصے میں بادشاہ کی کایا کلپ ہو چکی تھی۔ کہنے والے کا بھلا، سننے والے کا بھلا، شہرزاد کی جان بچی لاکھوں پائے۔ بادشاہ نے عورتوں کے قتل سے توبہ کی اور فلاح پائی۔

تو یہ تھی الف لیلہ کی وجہ پیدائش۔ میں نے شہرزاد کے بھید کو پالیا۔ کہانی رات کو اسی لیے سنائی جاتی ہے کہ وقت کٹے اور رات کٹے۔ میں بھی ایک لمبی کالی رات کے بیچ سانس لے رہا ہوں۔ اس رات کا رشتہ شہرزاد کی راتوں سے ملتا ہے۔ تو گویا اس رات کا بھی توڑ یہی ہے کہ کہانی کہی جائے۔ جب تک رات چلے کہانی چلے اور اسی طور پر جو شہرزاد نے اختیار کیا تھا، یعنی دیکھا کہ ارد گرد کی فضا میں تو خون کی بو بسی ہوئی ہے۔ انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ہیں، دہشت اور خوف کا سماں ہے۔ تب اس نے ارد گرد سے ذہنی بے تعلقی کا رویہ اپنایا اور کہانیوں کی ایسی دنیا میں نکل گئی جس کی فضا حاضر و موجود سے یکسر مختلف تھی۔ میں نے سوچا چلو ہم بھی اسی راہ پر چلتے ہیں اور اس دنیا میں نکل جاتے ہیں، جہاں بس رات تھی اور کہانی تھی۔ داستانیں، کتھائیں، کہانیاں، گل نے صنوبر کے ساتھ کیا کیا، حسن بانو نے حاتم سے کیا کیا سوال کیے اور حاتم کیا کیا جواب لایا۔ دیو کے قلعہ میں قید شہزادی شہزادے کو دیکھ کر کیوں روئی اور کیوں ہنسی۔ کلیلہ نے دمنہ کو کیا نصیحت کی اور دمنہ نے اس کا کیا جواب دیا۔ جتنے سوال اتنی کہانیاں۔ ہر کہانی جوکھوں بھرے سفر کی بپتا۔ جھانک کر باہر دیکھا۔ اچھا شب فتنہ تو اور

لمبی کھنچ گئی۔ تو پھر کہانی شروع ہو گئی۔ شہزادہ بنوں کی خاک چھانتا، نگر نگر گھومتا، خستہ و درماندہ ایک نرالے ہی نگر میں جانکلا۔ دیکھا کہ ایک بلند وبالا قلعہ ہے جس کے کنگرے آسمان سے باتیں کرتے ہیں، کتنی کھوپڑیاں ان کنگروں میں لٹکی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھ کے حیران اور ہراساں ہوا۔ چلتے چلتے ایک بزرگ کی صورت نظر آئی۔ شتابی سے اس کے پاس پہنچا اور پوچھا، اے صاحب یہ کون سا نگر ہے اور یہ قلعہ کیسا ہے جس کے کنگروں میں سر لٹکے ہوئے ہیں جس کے سر قلم ہوئے وہ کون تھے جس نے قلم کیے وہ کون ظالم ہے۔

بزرگ نے اسے سر سے پیر تک غور سے دیکھا پھر یوں گویا ہوا کہ اے جوان، مقرر تو اس شہر میں نووارد ہے۔ تیری کم بختی تجھے اس شہر میں لے آئی ہے۔ اپنی جوانی پہ رحم کھا اور شتابی سے یہاں سے نکل جا۔ یہ شہر قیموس ہے۔ قلعہ یہ شاہ قیموس کا ہے کہ دختر بداختر اس کی مہر انگیز ہے۔ حسن وہ پایا ہے کہ دنیا کے سات پردوں میں اس کا جواب نہیں۔ پر اپنے امیدواروں کے لیے شقی القلب، ہر امیدوار سے سوال کرتی ہے کہ گل باصنوبر چہ کرد۔ شرط لگا رکھی ہے کہ امیدوار کے لیے اس سوال کا جواب لازم ہے۔ صحیح جواب دے دیا تو اسے اپنا سر تاج بناؤں گی نہ دے سکا تو سر قلم کرا کے قلعہ کے کنگرے میں لٹکاؤں گی۔ قلعہ کی ڈیوڑھی میں سنہری چوب اور نقارہ رکھا ہے۔ کتنے شہزادے آئے۔ انہوں نے نقارے پر چوب لگائی۔ شہزادی کے حضور میں ان کی طلبی ہوئی۔ وہی ایک سوال گل باصنوبر چہ کرد۔ اب تک تو کسی سے جواب بن پڑا نہیں ہے۔ بس یہ انہیں کی کھوپڑیاں ہیں جو تو کنگروں میں لٹکا ہوا دیکھتا ہے۔

شہزادے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نقارے کی طرف لپکا۔ بزرگ چیختا چلّاتا رہ گیا کہ ہائیں یہ کیا کرتا ہے۔ کیوں اپنی ہیرا سی جان کو گنواتا ہے۔ اس نے کچھ نہ سنی۔ نقارے پہ ایسی چوب لگائی کہ پورا شہر گونج اٹھا۔ اہل شہر نے دہائی دی کہ ایک اور جان گئی۔ ایک اور سر کے قلم ہونے کی باری آئی۔ مگر یہ کیا ہوا۔ اچانک رونے پیٹنے چیخنے چلّانے کی

آوازیں آنے لگیں۔ الٰہی خیر' یہ کیسا شور ہے۔ کیسی کہانی ہے' کہاں کے گل و صنوبر' محلّہ میں تو قیامت مچی ہوئی ہے۔ اے بھائی کیا ہوا۔ دہشت گرد' ارے کیا کہہ رہے ہو' دہشت گرد یہاں کہاں سے آگئے۔ بس آگئے۔ ڈھاٹے باندھے کلاشنکوفیں تانے مسجد میں آن دھمکے۔ ٹھائیں ٹھائیں۔ دم کے دم میں کتنے نمازی خون میں لت پت مسجد کے صحن میں تڑپنے لگے۔

سننے والے دہشت زدہ رہ گئے۔ میرے حواس غائب' دماغ مختل' ایک بزرگ نے ٹھنڈا سانس بھرا "کیا زمانہ آگیا ہے مسلمان مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں اور خانۂ خدا میں آکر۔"

دوسرے بزرگ نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا "میں نہیں مانتا کہ یہ مسلمان تھے۔ مسلمان مسلمانوں پر گولی نہیں چلا سکتا اور پھر خانۂ خدا میں۔"

"پھر کون تھے۔" ایک نوجوان نے غصے سے کہا۔

"دشمن کے ایجنٹ۔" دوسرے بزرگ نے اعتماد سے کہا۔

"مولانا۔" نوجوان غصے سے کانپنے لگا۔ "کب تک ہم ایسی باتیں کر کے اپنے آپ کو دھوکہ دیں گے۔" پھر رک کر بولا: "مسلمان مسلمانوں پر گولی نہیں چلا سکتا' مولانا آپ نے شاید مسلمانوں کی تاریخ نہیں پڑھی ہے۔"

"ہاں اب کل کے لڑکے ہمیں ہماری تاریخ پڑھائیں گے۔"

اس بحث نے میرے دماغ کو اور پراگندہ کر دیا۔ میں الٹے پاؤں گھر آیا۔ کیا کروں' کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دماغ پراگندہ تھا۔ طبیعت پریشان' جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے۔ مہینوں یہی احوال رہا۔ کہانی کا خیال ہرن ہو چکا تھا۔ پھر طبیعت اس طرف آئی بھی تو اس طرح کہ گل و صنوبر کے قصے سے مجھے وحشت ہونے لگی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اسی کہانی کی طرف میرا دھیان کیوں گیا۔ کیوں لکھنے کے لیے میں

نے اس کہانی کو چنا جہاں ایک شہزادی دہشت گرد بنی بیٹھی ہے۔ جو نوجوان محبت کے جذبے سے سرشار اس کے سامنے آکر سر نیاز خم کرتا ہے۔ یہ اس کا سر قلم کر دیتی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ماضی قدیم کی طرف بھی جاتے ہیں تو اپنے عہد کے انگارے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یا یہ میری کمزوری تھی کہ میں نے اپنے زمانے کی تشدد بھری فضا سے رسہ تڑا کر پرانی کہانیوں کی دنیا میں اماں چاہی مگر اس پر دھیان نہیں دیا کہ میرے زمانے کے انگارے بھی میری ذات سے لپٹے لپٹے میرے ساتھ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ میں نے پھر شہر زاد کو یاد کیا۔ اس نے کس کمال سے اپنے دل و دماغ کو اپنے ارد گرد کے تشدد اور دہشت کی فضا سے آزاد کیا تھا اور کس طرح اپنی ذات سے اپنی کہانیوں کو الگ کیا تھا کہ اس کی سنائی ہوئی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یہ گمان تک نہیں گذرتا کہ یہ ایسی شخصیت کے تخیل کی پیداوار ہیں جس کی موت چند گھڑیوں کے فاصلہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پتہ نہیں یہ شہر زاد کا کمال تھا یا ان داستان گویوں کا جن کے مشترکہ تخیل نے اس بے مثال کردار کو جنم دیا تھا۔ وہ داستان گو کون تھے' ان کا تو ہمیں پتہ نہیں۔ میرے لیے تو شہر زاد ہی الف لیلہ کا مرکزی کردار بھی ہے اور الف لیلہ کی خالق بھی۔ غالب نے اپنے خطوط میں کہیں کہا ہے کہ شاعر کی انتہا یہ ہے کہ فردوسی بن جائے۔ میرے حساب سے کہانی کار کی انتہا یہ ہے کہ شہر زاد بن جائے۔

خیر تو میں نے شہر زاد سے سند لے کر پھر کہانی کی طرف رجوع کیا۔ اب کے طے کیا کہ اپنے زمانے سے باہر نہیں جاؤں گا مگر اپنے زمانے کے انگاروں کو قریب نہیں پھٹکنے دوں گا۔ ڈیڑھ دو کہانیاں لکھ چکا تو ایک دانشور دوست نے طعنہ دیا کہ خوب افسانہ نگار ہو۔ افغانستان میں بم برس رہے ہیں' پاکستان کی سرحدوں پر خطرے منڈلا رہے ہیں' دنیا کے اعصاب پر دہشت گرد سوار ہیں اور تم یہاں بیٹھے چڑے چڑیا کی کہانی لکھ رہے ہو۔ یہ فراریت پسندی نہیں ہے تو کیا ہے۔

اس ردعمل نے مجھے بہت مطمئن کیا۔ یعنی حاضر کے آشوب سے یکسر بے تعلقی پیدا کر کے کہانی لکھنے کی میری کوشش کامیاب ہوئی۔ اسی ہنگام مجھے منیر نیازی کی ایک نظم یاد آئی۔ اس کا عنوان ہے جنگ کے سائے میں جنت ارضی کا خواب۔ نظم اس طرح ہے۔

کبھی جامن کی شاخوں میں
کبھی فرش زمرد پر
یہ گلدم گا رہی ہے راگنی عہد محبت کی
کھلی چٹیل زمینوں سے
غبارِ شام میں اڑتی
صدائیں گھر میں واپس آ رہے مسرور لوگوں کی
افق تک کھیت سرسوں کے
گلاب اور سبز گندم کے
حویلی کے شجر پہ شور چڑیوں کے چہکنے کا
عجب حیرانیاں سی ہیں
مکانوں اور مکینوں میں
کہ موسم آ رہا ہے گاؤں کے جنگل مہکنے کا

اس نظم میں جنگ کہاں ہے۔ جنگ کی طرف کوئی اشارہ کوئی کنایہ، کچھ بھی نہیں مگر اسی میں تو نظم کی کامیابی کا راز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں تخلیقی ذہن نے جنگ کے خیال سے مغلوب ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ گویا جنگ کے مقابلہ میں تخلیقی ذہن کی فتح کا اعلان ہے۔

میں منیر نیازی کو داد دینے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی چڑے چڑیا کی کہانی پر داد دینے لگا تھا کہ ایک قاری نے اس کہانی کا کچھ اور ہی مطلب نکالا۔ اس نے

اسے علامتی کہانی کے طور پر پڑھا اور اس میں ہمارے زمانے کی انسانی صورتحال کا ایک عکس دیکھ لیا۔ کہانی کی اس تعبیر نے مجھے پریشان کر دیا۔ میری تو ساری ریاضت پر پانی پھر گیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اپنے زمانے کے انگارے کہانی میں پھر راہ پاگئے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں بالآخر فراری کہانی لکھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اگر فراریت پسندی کی راہ کہانی کو بچایا جا سکتا ہے تو یہ سودا کیا برا ہے لیکن اگر اس قاری نے اس کہانی کو اسی طرح سمجھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ لاکھ اپنے زمانے سے بھاگیں زمانہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ سات پردوں میں چھپ کر بھی کہانی لکھیں گے تو زمانے کے انگارے وہاں پہنچ کر کہانی کو آنچ دیں گے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر شہرزاد سے رجوع کیا۔ اور کس سے رجوع کروں، کس سے پوچھوں۔ کہانی میں حرف آخر تو شہرزاد ہی ہے۔ شاعر کی انتہا یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ کہانی کار کی انتہا یہ ہے کہ شہرزاد بن جائے۔ اس انتہا کو اور کس نے دیکھا ہے۔ میں کیا کھا کے اس انتہاء کو چھوؤں گا۔ مگر آرزو کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ سو پھر اسی نیت کے ساتھ کہانی لکھنے بیٹھ جاتا ہوں مگر پھر وہی قصہ ...... اسی طرح کی کھنڈت اور اب مجھے ایک خیال اور آیا۔ زمانہ تو تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا، اس سے کہاں تک بھاگو گے۔ تو ایک دفعہ یہ کڑوی گولی نگل لو۔ یعنی ہمارے زمانے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے بھاگو مت۔ پہلے اس سب کچھ کو قبول کرو۔ پھر شاید اس سے گریز کی بھی راہ نکل آئے۔ تو اچھایوں ہی سہی۔ قہر درویش بر جان درویش۔ یہ کر کے بھی دیکھ لیں۔ اور آخر مجھے جہاد تھوڑا ہی کرنا ہے، کہانی ہی لکھنی ہے، جب تک لکھی جا سکے اور جیسی بھی لکھی جا سکے رات باقی کہانی باقی۔ سو جب تلک بس چل سکے ساغر چلے کہانی چلے۔

انتظار حسین
مجموعہ:
دلی جو ایک شہر تھا
چراغوں کا دھواں
اجمل اعظم
جنم کہانیاں
قصہ کہانیاں
ناول:
بستی
تذکرہ
چاند گہن
آگے سمندر ہے
افسانے:
خیمے سے دور
زمین اور فلک اور
آخری آدمی
کنکری
دن اور داستان
خالی پنجرہ
گلی کوچے
کچھوے
شہر افسوس
تراجم:
گھاس کے میدانوں (ناول) چیخوف
فلسفہ کی نئی تشکیل (فلسفہ) جان ڈیوی
An Unwritten Epic & other Stories
سفرنامے:
نئے شہر پرانی بستیاں
زمین اور فلک اور
Rs.
www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1332-0
9 789693 513325